ہفت روزہ

ندائے خلافت

۱۵/ اگست ۱۹۹۴ء

☆ داعیٔ تحریک کے خطباتِ خلافت : نظامِ خلافت کا سماجی پہلو

☆ کراچی — "را" کا ہاتھ ہے تو حکومت "بے دست و پا" کیوں؟

☆ زندگانی کی گزرگاہوں میں -- قارئینِ کرام سے ایک ذاتی سوال

حدیثِ امروز — رونے دھونے سے کچھ ہوا ہے نہ ہوگا

ہم سب کا وطن' ملک خداداد پاکستان آج جس مخدوش صورت حال سے دوچار ہے اس کی نزاکت پر اضطراب کا اظہار ہم بھی کرتے رہتے ہیں اور کون نہیں جو خطرے کی گھنٹیوں کی آواز نہیں سن رہا۔ ہر صبح اخبارات ہوش و حواس کی بچی کھچی پونجی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ لرزہ خیز جرائم کی خبروں اور دلوں کو دہلادینے والے بیانات پر مستزاد کالم نویسوں اور تجزیہ نگاروں کی وہ تحریریں ہیں جن سے مستقبل کی طرف سے تشویش اور بے یقینی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مال مست' حال مست اور کھال مست لوگوں کے لئے تو یہ اب معمول کی باتیں بن گئی ہیں جن کا رویہ "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ' گھبرائیں کیا!" سے عبارت ہے اور جو لاتعلقی کے خول میں پناہ لے کر اسے روز بروز دبیز تر بناتے جارہے ہیں' احساس زیاں سے بھی محروم ہوگئے ہیں لیکن سوچنے سمجھنے والوں کی سوا مشکل ہے۔ وہ دردانگیز نوحہ کہتے اور لکھتے بھی ہیں اور اسباب و علل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ چارہ جوئی میں اپنی سی سعی بھی کرتے ہیں تاہم ان میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے جن کی نظریں اس مسبب الاسباب کی طرف بھی اٹھتی ہوں جس کے اذن کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا۔ اوروں سے کیا شکایت' خود علمائے کرام اور بزعم خویش خدام دین کا حال یہ ہے کہ سیاسی بیانات میں ایک سے بڑھ کر ایک دور کی کوڑی لاتے ہیں' نئے سے نیا شگوفہ چھوڑتے ہیں' نہیں بیان کرتے تو وہ بات جس کی طرف عامۃ الناس کو متوجہ کرنا ان کا فرض منصبی ہے۔ یہ حضرات اربابِ حل و عقد کو بھی نصیحت و خیرخواہی کا حق ادا کرتے ہوئے اس انداز میں خبردار نہیں کررہے جو انبیاؑ کے وارث ہونے کے اعتبار سے انہیں اختیار کرنا چاہئے۔

بہیمانہ جرائم کی مبالغے کی حد تک کثرت میں موجودہ حکومت و انتظامیہ کی کوتاہی و کم کوشی اور سابقہ حکومتوں کی چشم پوشی و سہل انگاری کے عوامل سے کون انکار کرے گا لیکن کیا یہ بھی ایک سنگین حقیقت نہیں کہ اس سرطان کو قوم کے جسد میں پروان چڑھانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہمارے اس طرز زندگی پر ہے جو بے بندگی ہونے کے باعث محض شرمندگی ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم اپنی حیات انفرادی و اجتماعی کے معمولات و معاملات میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی واضح تعلیمات سے منہ موڑ کر اپنے نفس کے جائز و ناجائز مطالبات کے سامنے سپر ڈال چکے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف ابلیس کا عریاں رقص جاری ہے' ذرائع ابلاغ ماحول میں پہلے سے سلگتی خواہشات نفسانی کی آگ پر تیل چھڑک رہے ہیں لیکن یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیطان لعین اور اس کی ذریت بندگان خدا کو بہکانے اور اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کی مہلت تو ضرور رکھتی ہے' اختیار سے بالکل محروم ہے۔ شیطان کی دکھائی ہوئی راہ پر چلنا یا اسے دھتا بتانا ہمارے اپنے اختیار میں ہے جس کے لئے ہمیں ہر دم اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

رہا اس فرسودہ و فاسد نظام کا مسئلہ جو ہم پر مسلط ہے' معاشرے کے بگاڑ کی جڑ ہے اور جس کی سب سے بڑی "برکت" سیاسی قیادت کا دینی و اخلاقی افلاس اور ارباب اقتدار کی بے راہ روی و نااہلی ہے' اسے "اندر سے" بدلنے کی خواہش و کوشش مجذوب کی بڑ اور دیوانے کے خواب کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس پر تو باہر سے ضرب ابراہیمی لگا کر پاش پاش کرنا ہوگا اور یہ کسی ایسی انقلابی جدوجہد کے ذریعے ہی ممکن ہے جس کا نہج بھی انہی مراحل انقلاب سے مستعار لیا گیا ہو جس کا عملی نمونہ تاریخ انسانی کے سب سے بڑے انقلابی' محمد رسول اللہ ﷺ نے پیش کیا تھا۔ رونے دھونے سے تو آج تک کچھ ہوا نہ آئندہ کوئی نتیجہ نکلے گا' آیئے تجدید ایمان' توبہ اور تجدید عہد کی ضرورت کا احساس عام کریں۔ اپنی انفرادی زندگیوں میں اس خلافت کا حق ادا کریں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سرفراز فرمایا اور پھر اپنی اجتماعیت کو نظام خلافت میں ڈھالنے کی انقلابی جدوجہد میں شریک ہوجائیں۔ اسی میں ہماری دنیا کی بھلائی ہے' اسی میں آخرت کی سرخ روئی!○○

قیمت ۶ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الہدیٰ

حج کے مہینے متعین ہیں'

(کہ حج کے چند مہینے متعین بھی ہیں اور سب کو معلوم بھی۔ مشرکین عرب اپنی ضرورت کے تحت ان مہینوں میں جو تغیر و تبدل کر لیتے تھے وہ سراسر ایک بے بنیاد اور خلاف عقل و فطرت معاملہ تھا۔ حج کا احرام انہی ایام میں باندھا جاسکتا ہے جو حج کے لئے مقرر و متعین ہیں اور یہ کوئی ایسی زیادہ طویل مدت بھی نہیں ہے کہ اس میں احرام کی پابندیوں کو ملحوظ رکھنا مشکل اور دشوار نظر آئے!)

سورۃ البقرہ
(آیت نمبر ۱۹۷)

تو جو کوئی ان میں حج کا عزم کرے تو پھر حج کے دنوں میں اسے نہ شہوت کی کوئی بات کرنی ہے' نہ فسق و فجور کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی'

(حج کا احرام باندھنے کے بعد تین چیزوں سے اجتناب لازمی ہے۔ i) رفث سے یعنی ہر نوع کی شہوانی باتوں سے۔ ii) فسوق سے یعنی اللہ کی نافرمانی اور معصیت سے اور iii) جدال سے یعنی' آپس کے لڑائی جھگڑے اور بدکلامی سے' کہ ان تینوں چیزوں کی ممانعت دراصل نفسانی محرکات کے ان تمام دروازوں کو بند کرنے کا باعث بن جاتی ہے جن سے انسان گناہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔)

اور تم نیکی کے جو کام بھی کرو گے اللہ اسے جانتا ہے'

حافظ عاکف سعید

(حالت احرام میں جذبات و شہوات کی یہ قربانی ہرگز رائیگاں جانے والی نہیں ہے۔ تمہاری ہر نیکی خواہ بڑی ہو یا چھوٹی اللہ کے علم میں ہے۔ خلوص و اخلاص سے کی گئی کوئی نیکی بلا اجر نہیں رہے گی' آخرت میں اس کا بھرپور اجر تمہیں مل کر رہے گا)

اور زاد راہ لے لیا کرو کہ سب سے بہتر زاد راہ پرہیزگاری ہے' اور مجھ سے ڈرتے رہو' اے عقل والو○

(حج کا سفر یقیناً ایک بابرکت سفر ہے جو ایک نیک مقصد کے لئے کیا جاتا ہے لیکن اس کے لئے خالی ہاتھ نکل کھڑے ہونا کہ پھر راستے میں انسان فقر و احتیاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرتا پھرے' کسی طور صحیح نہیں۔ کچھ نہ کچھ زاد راہ اور توشہ سفر ضرور ساتھ ہونا چاہئے کہ انسان اپنی عزت نفس کا دھیلا کرنے سے بچ جائے' لیکن اس مادی سامان سفر کے ساتھ ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری کی باطنی پونجی بھی سفر میں ساتھ ہونی چاہئے کہ جو انسان کو قدم قدم پر گناہ و معصیت کی پرخار جھاڑیوں میں الجھنے سے بچا سکے کہ بلاشبہ بہترین توشہ سفر تو تقویٰ اور پرہیزگاری ہی ہے!)

جوامع الکلم

جہنم کی آگ سے بچو خواہ کھجور کی ایک قاش کے ذریعے'

(نار جہنم سے خود کو دور رکھنے کا ایک موثر ذریعہ' از روئے فرمان نبوی ﷺ یہ ہے کہ انسان صدقہ و خیرات کے میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے۔ اپنا مال' جو درحقیقت اس کا ذاتی نہیں اللہ کا عطا کردہ ہے' خدمت دین اور خدمت کے کاموں میں صرف کرے۔ صدقہ و خیرات اور انفاق مال کی آنحضور ﷺ نے اس درجے تاکید فرمائی ہے کہ کے پاس اگر راہ خدا میں دینے کے لئے محض کھجور کی ایک قاش ہے تو اسے بھی اللہ کی راہ میں دے ڈالے اور خود کی آگ سے بچانے کا کوئی موقع ضائع نہ ہونے دے!)

(الحدیث)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

پندرہ روزہ
ندائے خلافت
لاہور

جلد ۳ شمارہ ۳۱
۱۵/ اگست ۱۹۹۴ء
15

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تحریکِ خلافت پاکستان
۴ اے مزنگ روڈ۔ لاہور

مقام اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

ناشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ: -/۶ روپے
سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) -/۱۲۵ روپے

زرتعاون برائے بیرون پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۲ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۰ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۶ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۲۰ " "

ایں گلِ دیگر شگفت

اب تک اس خیال کو ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ قائد اعظم علیہ رحمت کا ارادہ پاکستان کو نمونے کی ایک اسلامی ریاست بنانے کا تھا۔ البتہ ایک محدود اقلیت ان کے بعض اقوال بالخصوص نئے ملک کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں ان کی تقریر کے چند جملوں کو ایک خاص مفہوم دے کر یہ دعویٰ کرتی ہے کہ قائداعظم نے واضح طور پر پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ کی شکل دینے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ تاہم اس دعوے کو پزیرائی حاصل نہیں ہو سکی کیونکہ معمار پاکستان کے اس نوع کے فرمودات بہت بڑی تعداد میں محفوظ ہیں کہ ہم پاکستان کو اسلام کے اصول اخوت و حریت و مساوات کا ماڈل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں یا یہ کہ مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا آئین کیا ہو گا اور میرا جواب یہ ہے کہ وہ تو قرآن کی شکل میں ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے' وغیرہ---- اور اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار کی مجال نہیں کہ تحریک حصول پاکستان آخری مرحلے میں اپنی کامیابی کے لئے اس نعرے کی مرہون منت ہے جس کی گونج خیبر سے راس کماری تک سنائی دی گئی کہ "پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ"۔

جنگ آزادی میں صحافتی محاذ پر داد شجاعت دینے والے قائداعظم کے سپاہی زیڈ اے سلہری جنہیں "مائی لیڈر" سے قربت کی سعادت اور ان کی براہ راست ہدایات کے تحت کام کرنے کا موقع ملا اور جو آج تک ان کی محبت و عقیدت کے نشے سے سرشار ہیں' پہلے "پاکستانی قومیت" کے چپو کی مدد سے ملک خداداد کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کی وکالت کیا کرتے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے وہ اس اعتراف پر مجبور ہو چکے ہیں کہ خود قائداعظم بھی اسی مسلم قومیت کے علمبردار تھے جس کی بنیاد اسلام پر تھی اور ہے۔ ۳۱/ جولائی کے "جنگ" لاہور میں "ہم نے کہاں ٹھوکر کھائی؟" کے زیر عنوان اپنے کالم "مسائل و افکار" میں ایک بار پھر انہوں نے کھل کر اپنے تازہ موقف کی وضاحت کی ہے۔ پورے کالم کا رنگ یہی ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو اقتباسات سے ہو جائے گا:

"اس محاذ آرائی میں اسلام نمایاں طور پر سامنے آیا کیونکہ اس صورت میں یہ ایک مذہبی تنازع بن کر ابھرا کہ آیا مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک قوم بنتے ہیں یا وہ ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ یہ بات پاکستان کے جواز میں ایک اہم تنازع کی حیثیت رکھتی تھی اور اس پر پوری تفصیل کے ساتھ تیز و تند انداز میں بحث ہو چکی تھی لہٰذا اس بحث میں اسلام کو مرکزی حیثیت حاصل تھی چنانچہ اس کے تصفیئے میں پورے سات سال صرف ہو گئے۔ ایسی صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ مسلم لیگ کے پیروکاروں نے نعرہ لگایا کہ "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ" ..... گاندھی نے اس پر اپنے طنز آمیز تبصرے میں کہا کہ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مذہب تبدیل کرنے والوں کی کسی جماعت نے اپنی اصل قوم سے ہٹ کر علیحدہ قومیت کا لبادہ اوڑھ لیا ہو۔" اور "یہ پہلا موقع تھا کہ عوام کے ووٹوں کی قوت سے نہ صرف ایک ملک معرض وجود میں آیا بلکہ اسلام کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا۔ اب ایسے ملک کی تقدیر کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اسلام ہی وہ چٹان ہے جس پر یہ ملک کھڑا ہے۔"

اور عجیب اتفاق ہے کہ اسی روز کے جنگ میں سلہری صاحب کے کالم کے عین نیچے مراسلات کے زمرہ میں مسی ساگا (کینیڈا) میں مقیم ایک پاکستانی مسلمان بیگ حسن اختر مرزا نے "قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے" کا جواب دیتے ہوئے ایک نیا گل کھلایا اور اس پر مستزاد اگلے ہی روز پنجاب کے لاٹ صاحب' جناب الطاف حسین نے روزنامہ پاکستان کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی اسی نوع کی گوہر افشانی فرمائی ہے۔ وہ مراسلہ اس قابل ہے کہ پورے کا پورا یہاں پیش کیا جائے:

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب ... نیازی ہمیں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں اسلامیات پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۹۴۶ء ... جب حضرت قائداعظم مرحوم و مغفور لاہور تشریف لائے۔ آپ ان سے ملاقات کرنے کے بعد کلاس میں تشریف لائے اور فرمایا "لڑکو! میں آج قائداعظم سے مل کر آیا ہوں اور بہت مایوس ہوا ہوں اس لئے کہ میں نے ان سے پوچھا کہ "قائداعظم آپ پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم کریں گے" تو انہوں نے بلا تامل فرمایا کہ "جس طرح کی حکومت اتاترک نے ترکی میں قائم کی تھی"

چونکہ یہ تاریخ ساز بات ہے اس لئے یقیناً مولانا کو بھی یاد ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ میرے تب کے کافی ساتھی ابھی پاکستان میں زندہ سلامت ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ کینیڈا میں سے بھی کوئی عینی اور تائیدی شاہد مل جائے وگرنہ "مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" اور میں بیان حلفی دینے کے لئے تیار ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے صرف اور صرف اس دو ٹوک فیصلہ کی تائید یا تردید چاہئے۔ کسی کے جذبات، احساسات، تفکرات یا نظریات سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ گستاخی معاف، مولانا کیا ان دنوں مسلمانان ہند کے بیسویں صدی کے "سیاسی مجدد" اور ملت اسلامیہ کی کشتی کے "ناخدا" کے فرمودات کی صریحاً خلاف ورزی نہیں ہو رہی؟ کیا ان کے افکار کی سراسر نفی نہیں کی جا رہی؟ کیا وہ، جنہوں نے آج تک نظریہ پاکستان اور وجود پاکستان کو تسلیم نہیں کیا، مسند اقتدار پر براجمان ہونے کے لئے قوم کے ساتھ نہیں کھیل رہے؟ اگر خدانخواستہ وہ کامیاب ہو گئے (خاکم بدہن) تو کیا کچھ ایسا نہ ہو جائے گا کہ۔ "منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے" خدا قائداعظمؒ کی لحد کو ٹھنڈا رکھے، آمین اور ان کی امانت کی حفاظت تاقیامت کرے ثم آمین!

عیار، آستین کے سانپ، چولے بدل بدل کر آ رہے ہیں، لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

"بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

مجھے اپنے استاد محترم سے ہاں یا نہ میں جواب کا انتظار رہے گا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں، صحیح فیصلہ قوم خود کرے گی کہ آج تک اس کو نہ تو کوئی بہکاوے میں لا سکا نہ اس نے کبھی دھوکا کھایا ہے۔ نہ کوئی غلط فیصلہ کیا ہے اور نہ ہی کوئی غلط قدم اٹھایا ہے۔ وہ دوست اور دشمن کو اچھی طرح سے جانتی اور پہچانتی ہے۔"

جس ٹھسّے سے مراسلہ نگار نے اپنے استاد محترم سے اپنے سوال کا جواب مانگا ہے، اس کے تیور بتاتے ہیں کہ مولانا نیازی خاموشی میں عافیت محسوس کریں گے۔ وہ آخر کس منہ سے خاص طور پر آج کے حالات میں، اس بات کو دہرانے پر تیار ہوں گے کہ قائداعظم پاکستان میں صرف سیکولر ہی نہیں بلکہ ایک اسلام دشمن حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کیونکہ ترکوں کے بابا (اتاترک کے یہی معنی ہیں) مصطفےٰ کمال نے تو خلافتؑ کا علامتی ادارہ ختم کر کے ایک طرف امت مسلمہ کے رہے سہے رعب داب اور عزت و وقار کو خاک میں ملایا تھا جس پر پوری صلیبی دنیا میں گھی کے چراغ جلائے گئے تو دوسری طرف اسلام کو ان عربوں کی میراث قرار دے کر جنہوں نے دشمنوں کے ورغلانے پر ترکان عثمانی کے خون ناحق کی ندیاں بہا دیں، خود اسلام ہی کو بالجبر ملک بدر کر دیا تھا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ مصور پاکستان، علامہ اقبال نے جب یہ کہا کہ

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

تو جس سحر کا خواب انہوں نے دیکھا، جانتے تھے کہ اسے صنم خانہ ہند سے ہی طلوع ہونا ہے۔ اپنے اس خواب کی تعبیر کو پاکستان کے نام سے منصہ ظہور میں لانے کی امید میں خود انہوں نے قائداعظم کو انگلستان سے واپس آ کر مسلمانان ہند کے بکھرے ہوئے قافلے کو متحد کر کے آزادی کی منزل کی طرف گامزن کر دینے کی غرض سے قیادت کی دعوت دی تھی۔ یہ واقعات ہماری تاریخ کا حصہ ہیں اور کوئی کوشش انہیں وہاں سے محو کر دینے میں کامیاب نہ ہوگی۔ لیکن اب آخر قائداعظم سے منسوب اس طرح کے اقوال کی توجیہ کیا ہے؟۔ ہم اس سوال کا جواب پورے اعتماد سے دے سکتے ہیں، اس لئے کہ تنظیم اسلامی کے امیر اور تحریک خلافت کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد نے پچھلے دو برسوں میں نوائے وقت اور جنگ میں اپنے کالموں کے ذریعے اور قبل ازیں روشن دلائل و براہین کے زور پر براہ راست ہمارے قلوب و اذہان کو اس طرح کے مسائل کے بارے میں ہر نوع کے مخمصوں سے بالکل پاک صاف کر دیا ہے۔ ہمیں اپنے اس موقف کے ان اجزاء پر انشراح صدر حاصل ہے کہ:

☆ قائداعظم مسلمانان ہند کے عظیم محسن ہیں۔ انگریز اور ہندو کی دہری غلامی سے نجات دلا کر انہوں نے ہمارے حق میں وہی کام کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے کیا اور جو ان کی رسالت کے اولین فرائض میں شامل تھا۔

☆ ہم اپنی عادت بد کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ اپنے پسندیدہ مشاہیر سے کوئی بشری کمزوری تک منسوب کئے جانے پر مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ان قابل احترام بزرگوں کے بارے میں بھی جو ہمیں پسند نہیں، کوئی اچھی بات سننے کے روادار نہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ معصومیت انبیاء و رسل پر ختم ہو چکی ہے اور ان سب پسندیدہ و ناپسندیدہ لوگوں سے غلطیوں اور خطاؤں کا صدور ہوا ہے۔

☆ قائداعظم کی امانت و دیانت اور لیاقت و قابلیت کی قسم کھائی جا سکتی ہے تاہم آخری کامیابی حاصل کر لینے کے باوجود انہوں نے سیاسی غلطیاں بھی کیں جن کی تلافی کا انتظام اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے کرتا چلا گیا کیونکہ وہ ذات باری ہماری آہ و زاری پر مہربان ہو کر یہ فیصلہ فرما چکی تھی کہ انہیں مطلوبہ آزاد وطن دے کر آزمایا جائے کہ یہ اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے ہیں یا وہی ناہنجاری کی روش اختیار کرتے ہیں جو قوم موسیٰ نے کر کے دکھائی اور نقد عقوبت میں تو چالیس برس کی صحرا نوردی ہی پائی تھی، انجام کار "مغضوب علیہم" قرار پائی۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اس نحوست سے محفوظ فرمائے۔ آمین)۔

☆ قائداعظم عالم دین ہرگز نہ تھے اور علمائے دین کی عظیم اکثریت کا تعاون بھی انہیں حاصل نہ ہوا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود اور مسلم لیگ کی پوری قیادت کی زندگیاں چند مستثنیات کے سوا، ظواہر اسلام سے خالی تھیں یعنی وہ Practising Muslims نہ تھے۔ بایں ہمہ قائداعظم پوری بصیرت کے ساتھ اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد اسلام ہے اور ہم پاکستان اسلام ہی کے لئے حاصل کر رہے ہیں لیکن انہیں واضح طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے اور کیسے قائم کی جاتی ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے ان کے پاس وقت بھی نہ تھا (جنگ آزادی میں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا اور انہیں اپنی مہلت زندگی کے مختصر ہونے کا شعور بھی حاصل تھا) اور رجال دین نے بھی انہیں سمجھانے کا حق ادا نہ کیا۔

☆ بنا بریں وہ اسلام کے ساتھ پورا خلوص و اخلاص رکھنے کے باوجود اور اپنے واضح اعلانات کے

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

داعیٔ تحریک کے تیسرے خطبۂ خلافت کی چوتھی اور آخری قسط

نظامِ خلافت کا سماجی پہلو

مرتبہ: نثار احمد ملک

اسلام کا معاشرتی ڈھانچہ ترقی کی راہ میں حائل نہیں

اب میں آج کے خطبہ خلافت کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں۔ اس دوسرے حصے کا تعلق نظام خلافت کے تحت معاشرتی نظام کے اصول و مبادی سے ہے۔ اسلام کے معاشرتی نظام کے حوالے سے ایک بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس سے کسی نہ کسی درجہ میں واقف ہے جبکہ نظام خلافت کے تحت معاشی و سیاسی نظام میں جدید تقاضوں کے تحت اجتہاد کی بھی ضرورت ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام میں پردہ اور ستر لازم ہیں۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ وہ اس پر عامل نہیں ہے۔

یہ بات ان خطبات کے شروع میں ہی عرض کی گئی تھی کہ اجتماعی نظام کی پہلی منزل عائلی نظام ہے۔ اس پہلی منزل کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ "تدبیر منزل" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس پہلی منزل کے بعد بہت سے دوسرے عوامل شامل ہو کر معاشرت کو وجود بخشتے ہیں۔ جب ایک معاشرہ وجود میں آجاتا ہے تو پھر اقتصادی و سیاسی مسائل جنم لیتے ہیں' انہی مسائل کی کوکھ سے سیاسی و اقتصادی نظام وجود پاتے ہیں۔

اسلام کے معاشرتی نظام کے حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام میں پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ گویا کامل انسانی مساوات موجود ہے۔ پیدائشی طور پر نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا' نہ ہی نسل کی بنیاد پر' نہ رنگ کی بنیاد پر اور نہ ہی جنس کی بنیاد پر۔ اسلام میں ایسا ہرگز نہیں ہے کہ عورت' مرد سے گھٹیا تصور کی جائے۔ قرآن حکیم اس تصور کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "بعضکم من بعض" یعنی تم سب ایک دوسرے میں سے ہو۔ ایک ہی باپ کے نطفے سے بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی' اور ایک ہی ماں کے رحم میں دونوں نے پرورش پائی ہے۔ یہ بات کہنے میں جتنی سادہ ہے' دل و جان سے تسلیم کرنے میں اتنی ہی مشکل ہے۔ ہمارے ہاں ہندوؤں کو گالیاں دی جاتی ہیں کہ ان کے ہاں برہمن اور شودر کی معاشرتی تقسیم موجود ہے۔ لیکن بالکل اسی طرح ہمارے ہاں مسلی اور سید کی تقسیم موجود ہے۔ اسلام اس تقسیم کو کسی درجے میں قبول نہیں کرتا۔ اسلام کا پہلا اصل الاصول سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات ہے۔ اسلام کے تصور میں اگر مراتب کا فرق ہے تو وہ علم و تقویٰ کے حوالے سے ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ "ان اکرمکم عنداللہ اتقکم" اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے' جو زیادہ متقی ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو آپ اپنی محنت سے کسب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ چیزیں جو آپ کو عطا کی گئی ہیں۔ آپ کی پسند و ناپسند اور کسب و محنت کو اس میں دخل نہیں ہے' ان کو وجہ اعزاز و اکرام نہیں بنایا گیا۔ اللہ نے آپ کو جو رنگ اور شکل و صورت عطا کی ہے' اسی طرح آپ کو جس نسل میں پیدا کر دیا ہے اور جو جنس آپ کی بنا دی گئی ہے' ان چیزوں میں آپ کو کوئی اختیار قطعاً نہیں دیا گیا۔ لہٰذا جن چیزوں میں آپ کا اختیار نہیں ہے' ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں آتا ہے کہ "یاایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی وجعلنکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ن اکرامکم عنداللہ اتقکم" یعنی اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پہچان کے لئے تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا' بے شک اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہی ہے جو زیادہ متقی ہے۔

دستوری اور قانونی سطح پر مسلم اور غیر مسلم میں فرق واقع ہو جائے گا۔ یہ فرق بھی محض انتظامی ضرورت کے تحت ہو گا۔ اس لئے کہ ہم نے ایک نظام چلانا ہے۔ اس فرق کے حوالے سے بھی یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہاں بھی افضلیت اور مفضولیت کا معاملہ نہیں ہے۔ کبھی بھی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں مسلمان ہوں لہٰذا اس کافر سے افضل ہوں! یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مسلمان ایک کافر سے کیوں افضل نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا کچھ علم نہیں ہے کہ اس کا آنے والے کل کیا معاملہ ہو اور ہمارا کیا ہو۔ اس بات کا بھی امکان موجود رہتا ہے کہ کل کو میرا پاؤں پھسل جائے اور میں گمراہی کی غار کے اندر جا گروں۔ اور اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہدایت کا دروازہ کھول دیں۔ یہ کفر و اسلام کی تقسیم مستقل نہیں ہے جبکہ کالے اور گورے کی تقسیم تو مستقل ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کالا گورا ہو جائے لیکن کوئی کافر کلمہ پڑھ کر اس فرق کو ایک لمحے میں ختم کر سکتا ہے۔

ایک تقسیم انتظامی اعتبار سے ہے۔ یہ تقسیم افسر اور ماتحت کی ہے۔ اس تقسیم اور فرق کو ہمیں تسلیم کرنا ہو گا۔ شرف انسانیت کے اعتبار سے مرد اور عورت برابر ہیں۔ روحانی و اخلاقی بلندی کے لئے میدان دونوں کے لئے کھلا ہے۔ چنانچہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۳۵ میں ارشاد ربانی ہے کہ "ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات والقنتین والقنتت

اعتذار

گزشتہ شمارے میں داعی تحریک خلافت کے تیسرے خطبہ کی قسط میں مرتب نے سہواً اس عبارت کو "توخذ من اغنیائھم وترد الی فقرائھم" آیت قرآنی سمجھا جبکہ محترم خطیب نے اسے بطور حدیث نبوی ﷺ پیش کیا تھا اور اس حدیث مبارکہ کے الفاظ بھی درست نہ تھے صحیح الفاظ وہ ہیں جو اوپر نقل ہوئے ہیں۔ اس فاش غلطی پر مرتب اللہ تعالیٰ سے درگزر کا خواستگار ہے اور ادارہ بھی اس فروگزاشت میں کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا لہٰذا صاف سیدھی معافی طلب کرتا ہے۔

والصدقین والصدقت والصبرین والصبرات والخشعین والخشعت والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصئمت والحفظین فروجھم والحفظت والذکرین اللہ کثیر والذکرت اعداللہ لھم مغفرہ واجرا عظیما" اس آیت مبارکہ میں جتنے بھی اوصاف عالیہ گنوائے گئے ہیں اس میں مرد اور عورت دونوں کو شریک کیا گیا ہے۔ نہ جانے کتنے کروڑوں مرد حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے مقام و مرتبہ پر رشک کرتے ہوں گے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ شرف انسانیت کے اعتبار سے مرد اور عورت برابر ہیں۔ لیکن جب ایک مرد اور عورت رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے تو اب برابر نہیں رہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اب ایک ادارہ وجود میں آگیا ہے۔ گویا یہ ایک Family institution ہے۔ اس ادارے کا ایک سربراہ ہونا لازم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر کسی ادارے کے دو برابر درجے کے سربراہ ہوں گے تو اس ادارے کا بیڑہ غرق ہو جائے گا اس لحاظ سے قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ "الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم والصلحت قانتات حفظت للغیب بما حفظ اللہ" یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس فضیلت کی بنیاد پر جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے اور اس بنا پر کہ وہ اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ دراصل خاندانی ادارے کا نظم ہے اور اس پر ہمارا سارا فقہی نظام قائم ہے۔ خاندان کے ادارے کا سربراہ مرد ہے۔ وہ شادی کے وقت مہر ادا کرتا ہے۔ بالکل شادی جیسی ضرورت مرد کی ہے' ویسی ہی ورت کی بھی ہے۔ مرد عورت کے بغیر نامکمل ہے اور ورت مرد کے بغیر' اس کے علاوہ مرد کے ذمے کفالت ہے۔ وہ بیوی کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وراثت میں اس کا حصہ بیٹی کے مقابلے پر دگنا ہے۔ یہ تمام باتیں ایک دوسرے سے منطقی اعتبار سے انتہائی مربوط ہیں۔ اسلامی فلسفہ حیات کے کسی گوشے میں کوئی جھول واقع نہیں ہے۔

اسلام کے عائلی نظام کے حوالے سے علامہ اقبال مرحوم نے ایک بہت ہی اچھی بات کہی ہے۔ علامہ اقبال اپنے چھٹے لیکچر میں کہتے ہیں کہ لوگ اسلام کے عائلی قوانین پر بڑے سطحی انداز میں غور کرتے ہیں۔ اسی سطحی انداز کی وجہ سے وہ بہت سے اعتراضات کرتے ہیں۔ یہ لوگ گہرائی میں اتر کر غور نہیں کرتے۔ اسلام نے بات مجمل کہی ہے لیکن اگر اس اجمال پر گہرائی میں اتر کر غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ بات انتہائی معقول ہے۔ اسلام کے عائلی قوانین میں طلاق مرد کا اختیار ہے۔ یہ اختیار عورت کو نہیں دیا گیا۔ عورت خلع حاصل کر سکتی ہے' طلاق دے نہیں سکتی الا یہ کہ شادی کے موقع پر عورت نے بطور شرط حق طلاق منوالیا ہو گویا خاندان کے نظام کے استحکام کے لئے مرد کی قوامیت ضروری ہے۔

اسلام کے خاندانی نظام میں والدین کے حقوق Second dimension ہے۔ ایک مرد اور عورت سے خاندان کے ادارے کی ابتدا ہوتی ہے اس کے بعد اولاد کے ہوجانے سے Second dimension شروع ہو جاتی ہے۔ اب والدین اور اولاد کا رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد اولاد میں تعدد سے تیسرا رشتہ اخوت کا قائم ہو گیا۔ گویا ایک خاندان کے ادارے کی Three dimensions ہیں۔

اس ادارے کا استحکام مرد اور عورت کے درمیان قوی رشتہ پر منحصر ہے۔ اسی طرح جتنا اولاد اور والدین کے درمیان رشتہ مضبوط ہو گا اتنا ہی خاندان کا ادارہ مضبوط و مستحکم ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں چار مقامات پر اللہ کے حق کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان مقامات پر رسول کا بھی ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ لقمان میں آتا ہے کہ "ان اشکر لی ولوالدیک" شکر کرو میرا اور اپنے والدین کا اور یہی مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں آیا ہے کہ "وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا"۔ یعنی اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور والدین کے ساتھ حسین سلوک کرو گے۔ یہ سب اس لئے کہ اولاد اور والدین کا رشتہ مضبوط ہو اور والدین پورے اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو اپنی اولاد میں پوری طرح کھپا دیں۔ وہ اپنے بڑھاپے کے لئے اس فکر کے ساتھ کچھ بچا کر نہ رکھیں کہ اس وقت کہاں سے کھائیں گے۔ انہیں اطمینان ہو کہ ان کی اولاد انہیں ان کا بدلہ دے گی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہی آتا ہے کہ "رب ارحم ھما کما ربینی صغیرا" اے پروردگار ان دونوں پر رحم فرما جیسے انہوں نے مجھے پالا پوسا جبکہ میں چھوٹا تھا۔ اسی میں آتا ہے کہ "اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما○ واخفض لھما جناح الذل من الرحمہ وقل رب ارحم ھما کما ربینی صغیرا"

اس آیت مبارکہ کو پڑھیئے اور یورپ میں جا کر دیکھ لیجئے کہ جو حشر بوڑھے والدین کا ہوتا ہے۔ آپ ان کی حسرت اور محرومی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ بچارے سالہا سال اپنی اولاد کو دیکھنے کے انتظار میں گزار دیتے ہیں۔ وہ کرسمس کا انتظار محض اس خوشی میں کر رہے ہوتے ہیں کہ اس موقع پر بیٹے یا بیٹی کی شکل نظر آئے گی لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ اب اس موقع پر بھی انہیں نظر نہیں آتی! ان کے ہاں old home میں تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ وہاں ٹی وی سیٹ لگے ہوئے ہیں' بہترین کھانا میسر ہے۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ انسانی جذبات کسی اور چیز کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔

خاندان کے ادارے کے استحکام کے لئے ایک تیسرا عنصر ستر و حجاب ہے۔ اس اہم عنصر کی طرف بہت کم لوگوں کی توجہ ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ زنا کے سدباب کے لئے مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا اہم ترین تعلق جو خاندان کی مضبوطی کے ساتھ ہے' اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ یہ بات میں نے ہیرالڈ میں ایک انٹرویو میں کہی تھی۔ اس انٹرویو کو توڑ مروڑ کر شائع کیا گیا اور بعد میں اسی کا حوالہ ایک امریکن عورت نے اپنی کتاب میں بھی دیا۔ اس نے اپنی اس کتاب میں مجھ پر فقرے چست کئے ہیں۔ اصل بات کیا تھی جو میں نے کہی تھی! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ آپ غور کریں کہ جس معاشرے میں بے پردگی اور عریانی ہے' اس معاشرے میں اگر کوئی مرد کسی نامحرم عورت کو دیکھتا ہے اور وہ اس کی نگاہوں میں "کھب" جاتی ہے۔ اب اس کے خیالوں میں تو وہی بسی ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ظاہر بات ہے وہ یہ ہو گا کہ بیوی پر سے توجہ ہٹ جائے گی۔ اس سے شوہر اور بیوی کے درمیان جو رشتہ الفت و محبت موجود تھا وہ کمزور ہوا۔ اس رشتہ کے کمزور ہونے سے خاندان کا ادارہ عدم استحکام کا شکار ہوا۔ اس لئے اسلام نے عورت کے لئے پردہ لازم کیا ہے تاکہ شوہر کی پوری

توجہ بیوی پر اور بیوی کی شوہر پر مرتکز ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنسی خواہش انسان کے اندر بہت ہی طاقتور محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو کہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے' ان کی یہ بہت بڑی علمی خیانت ہے کہ وہ ایک طرف تو فرائڈ کو جدید نفسیات کا "امام" مانتے ہیں جبکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے اندر سب سے طاقتور جذبہ محرکہ شہوت ہے۔ ان مغرب گزیدہ لوگوں کی علمی خیانت یہ ہے کہ انہوں نے "مولویوں" کو بدنام کیا ہے کہ گویا یہ جنس کا جذبہ تو انہی کے ساتھ ہے۔ جب کبھی بھی ستر و حجاب کی بات ہوتی ہے تو یہ لوگ چیخ اٹھتے ہیں کہ ان مولویوں کو سوائے جنسیات کے اور کوئی بات آتی ہی نہیں ہے۔ جبکہ قرآن حکیم میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ازواج مطہرات کے بارے میں احکام دیئے جا رہے ہیں کہ نبی کی بیویوں سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ حالانکہ نبی ﷺ کی بیویاں امہات المومنین ہیں۔ لیکن کہا گیا کہ "ذلکم اطہر لقلوبکم و قلوبہن" یعنی یہی پاکیزہ ہے تمہارے دلوں کے بھی اور ان کے دلوں کے لئے بھی!

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر شوہر اور بیوی کی توجہ منتشر نہیں ہے تو اس سے باہمی اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب یہ باہمی مودت و الفت خاندان کے ادارے کی پختگی پر منتج ہوگی۔ اس میاں' بیوی کے باہمی اعتماد کے ماحول میں جو اولاد پروان چڑھتی ہے' وہ نہایت صحت مند نفسیات لے کر پروان چڑھتی ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو۔ شوہر کا بیوی پر سے اعتماد اٹھ جائے اور بیوی کا شوہر پر سے تو آپ اندازہ لگائیں کہ اس ماحول میں جو اولاد پروان چڑھتی ہے اس کے اندر بھی منفی نفسیات وجود میں آتی ہے۔ اس بے اعتمادی کے ماحول میں بچوں میں مثبت اوصاف کہاں سے پیدا ہوں گے!

اسلام نے عورت کے لئے ستر و حجاب کے احکام دیئے ہیں لیکن ان احکامات کی پابندی کے باوجود عورت کے لئے بہت زیادہ آزادی ہے۔ عورت کاروبار کر سکتی ہے نیز اپنی جائیداد رکھ سکتی ہے۔ اس ضمن میں شرط صرف یہ ہے کہ مخلوط معاشرت نہ ہو۔ اس کے علاوہ اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ "وقرن فی بیوتکن" کہ تمہاری اصل توجہ تمہارے گھروں پر ہونی چاہئے۔ یہ گھر تمہارا اصل دائرہ کار ہے۔ اگرچہ قانونی پابندی نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے معاشرے میں زنانہ اور مردانہ کالج علیحدہ علیحدہ موجود ہیں۔ جب ہم یونیورسٹی کے علیحدہ قیام کی بات کرتے ہیں تو مغرب گزیدہ طبقہ کے حلق میں اس کی ہڈی نہ جانے کیوں پھنس جاتی ہے۔ اسی طریقے سے زنانہ اور مردانہ ہسپتال بھی علیحدہ علیحدہ بنائے جا سکتے ہیں۔ جو ہسپتال زنانہ ہوں وہاں مریض بھی زنانہ ہی ہوں اور ڈاکٹر بھی زنانہ ہی ہوں۔ زنانہ ہسپتال میں Female نرسیں ہونی چاہئیں۔ اسی طرح مردانہ ہسپتالوں میں Male نرسوں کا اہتمام ہونا چاہئے۔ مردانہ ہسپتالوں میں زنانہ نرسیں فساد کی جڑ ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا Male نرس نہیں ہو سکتے؟ جبکہ فوج میں Forward Medical Units ہوتے ہیں جو محاذ جنگ پر جاتے ہیں۔ وہاں کوئی خاتون نرس نہیں ہوتی جبکہ وہاں نرسوں کی ضرورت بہت شدید ہوتی ہے۔ وہاں تو آپ خواتین نرسوں کو لے کر نہیں جاتے جبکہ عام مردانہ ہسپتالوں میں زنانہ نرسیں لگائی جاتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ کیا پی آئی اے میں کھانے اور ناشتے کی ٹرے مرد پیش نہیں کر سکتا؟

میں نے یہ بات مرحوم صدر ضیاء الحق صاحب سے بھی کہی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ یہ ایئر ہوسٹس جو ہفتوں گھر سے باہر جاتی ہیں یہ شریعت کے کون سے قاعدے کے مطابق جائز ہے جبکہ مسلمان عورت حج اور عمرہ کے لئے بھی محرم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ حالانکہ عموماً حج اور عمرہ کے لئے ادھیڑ عمر کی عورت جاتی ہے۔ اس کے برعکس پی آئی اے میں نوجوان بچیاں ہیں جو کہ ہیں ہیں دن ایک ملک سے دوسرے ملک میں فلائٹ کے ساتھ جاتی ہیں۔ آپ غور کریں کہ یہ کون ہیں؟ یہ محمد رسول ﷺ کی بیٹیاں ہیں۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بیٹیاں ہیں۔

یہ ہیں شریعت کے احکام۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ایک دفعہ یہ طے کریں کہ ہمیں شریعت پر چلنا ہے۔ یہ طے ہو جانے کے بعد میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ تمام کام ہوں گے لیکن علیحدہ علیحدہ دائرۂ کار کے تحت ہوں گے۔ یہ آگ اور پانی کا جوڑ جو کہ سارے فساد کی جڑ ہے' اسے بہرحال ختم کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں ایک بات کہی جا سکتی ہے بلکہ اکثر کہی جاتی ہے کہ آج کی دنیا معاشی دنیا ہے۔ لہٰذا اس معاشی دوڑ میں اگر آپ اپنی آبادی کا پچاس فی صد علیحدہ کر دیں گے تو دنیا کا مقابلہ کیسے کریں گے! اس کا جواب میں دے چکا ہوں کہ ایک دفعہ عزم کر لیا جائے تو راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ آپ گھریلو صنعت کا اہتمام کیجئے۔ عورتوں کو گھروں پر کام دیجئے تاکہ انہیں نکلنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ اسی طرح پرائمری ایجوکیشن مکمل طور پر خواتین کے حوالے کر دیں۔ یہ معاملہ تیسری چوتھی جماعت تک ہی ہونا چاہئے۔ اس سے آگے نہیں۔ یہ بچوں کی عمر کا وہ دور ہوتا ہے کہ انہیں شفقت و محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر مامتا کا جذبہ رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے صنعتی یونٹ بنائے جا سکتے ہیں جہاں عورتیں ہی نگرانی کریں اور عورتیں ہی کام کریں۔ اس ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ عورتوں کے اوقات کار مردوں کے مقابلے پہ کم ہونے چاہئیں تاکہ وہ ایک بیوی کی حیثیت سے بھی اپنی ذمہ داریاں ادا کر سکیں۔

میں اپنی بات کو اس نکتہ پر ختم کرتا ہوں کہ اسلام کا سماجی و معاشرتی نظام عہد حاضر کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت اپنے اندر پوری طرح رکھتا ہے۔ ہمیں اس حوالے سے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے دین پر عمل کرتے ہوئے دنیا کا نہ صرف مقابلہ کریں گے بلکہ ان سے آگے بڑھیں گے۔ لیکن اس آگے بڑھنے کے شوق میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے○○

بقیہ تلخ نوائی

مداخلت نہ بھی کرے تب بھی اس کا پس پردہ رہ کر سیاستدانوں کے درمیان ریفری کا کردار ادا کرنا حالات کو ابتر بنا رہا ہے۔ پاکستان کو اس انٹی بایوٹک کی بجائے صحت مند سیاسی نظام درکار ہے۔ کیونکہ ایک عرصے بعد وائرس پر اینٹی بایوٹک بھی بے اثر ہو جاتا ہے' سوائے اس کے کہ کوئی ڈرامائی تبدیلی واقع ہو۔ اکتوبر اور دسمبر کے درمیان اہم تبدیلیاں آئیں گی جس کی زد میں صدر اور وزیراعظم دونوں کے عہدے آئیں گے۔ دستوری اصلاحات' احتساب اور سیاسی اور سماجی نظام کی مکمل اوور ہالنگ' بہت پہلے ہو جانی چاہئے تھی۔ اگر یہ سارا کام ۱۴/ اگست ۱۹۹۷ء تک مکمل کر لیا جاتا ہے اور ملک کو ایک صحیح منتخب جمہوری حکومت مل جاتی ہے تو یہ اس کی پچاسویں سالگرہ پر ایک عظیم تحفہ ہوگا جو درحقیقت پاکستان کو تازہ زندگی عطا کرے گا۔

(بشکریہ امپیکٹ انٹرنیشنل' اگست ۹۴ء)

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

روانڈا کی آبادی ضمیرِ انسانی کے سامنے ایک مجسم سوال ہے

فرنگ کی ریشہ دوانیوں نے کوئی میدان نہ چھوڑا

"بنیاد پرستی" کا ہوّا اسلامی قدروں کو ہدف بنانے کے لئے کھڑا کیا گیا

کسی صاحب نے کچھ عرصہ پہلے شاید اسمبلی میں کہا تھا کہ ہم نے ہوش کے ناخن نہ لئے تو پاکستان (خدانخواستہ) صومالیہ بن جائیگا۔ صومالیہ تو نہیں، لیکن روانڈا میں آئیں دیکھتے ہیں کیا ہوا ہے؟

منجی کا مہاجر کیمپ ہیضے کی وباء پھوٹ پڑنے سے پرانے زمانے کی طاعون کے امراض سے اموات کی یاد دلاتا ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر ٹینٹ کے باہر ایک بچے نے جونہی دم توڑا، اس کی آنکھ کی پتلی سفید شیشے کی مانند ہو گئی۔ چند ہی لمحوں بعد ایک دوسرا نڈھال شخص موت کے منہ میں چلا گیا اور اس کے بعد تیسرا۔ اگلے روز تک ہر طرف مردہ جسم پڑے تھے اور درجنوں نعشیں اجتماعی تدفین کے لئے ٹرک میں ڈالی جا رہی تھیں۔ ایک چھوٹا سا لڑکا چیختا چلاتا ادھر ادھر بھاگ رہا تھا، اس کے باپ نے بتایا کہ اس کی ماں کل فوت ہو گئی ہے۔ ایک بچہ باپ کی کمر کے ساتھ بندھا ہوا تھا مگر اس میں جان نہیں تھی۔ زائرے اور روانڈا کی سرحد کے پاس ہی امدادی کارکنوں نے ایک بچے کو ہتھیاروں اور خشوں کے ڈھیر پر بیٹھے دیکھا جہاں پاس ہی اس کے ماں باپ کی نعشیں پڑی تھیں۔ دو، تین سال کا بچہ جو اپنا نام بتانے سے بھی قاصر تھا، غالباً دو روز سے وہاں بیٹھا تھا۔ ایک گولہ گرنے سے مہاجرین بدحواس ہو کر ایسے بھاگے کہ ایک سو سے زائد افراد ہجوم میں کچلے گئے۔ ایک امریکی امدادی عہدہ دار کا کہنا ہے کہ میں بیس سال سے افریقہ میں ہوں لیکن میں نے کبھی یہ حالات نہیں دیکھے۔

روانڈا سے ایک دم بھاگ کھڑے ہونے والے لوگوں نے مشرقی زائرے کو جہنم میں بدل دیا ہے۔ بھوک، پیاس بیماری اور خوف کے بارے میں لوگوں کا ایک سمندر ہے جو دور دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک عورت جو پیدل روانڈا سے یہاں پہنچی ہے، چھوٹی سی گٹھری کھول کر اپنا مردہ بچہ دکھاتی ہے جو سرحد سے دو گھنٹے کے فاصلے پر دم توڑ گیا تھا۔ ایک خاوند اپنی بیوی کو مایوس نگاہوں سے دیکھ رہا ہے جو ڈرپ کے باوجود ہیضہ سے دم توڑ رہی ہے۔ ایک بچہ اپنی مردہ ماں کو جگانے کی کوشش میں غم سے بلبلا رہا ہے۔

گزشتہ ہفتے کے آخر تک بیس لاکھ سے زائد لوگ ملک بھاگ کر جا چکے ہیں جو کل آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں اور غالباً اتنی ہی تعداد میں ملک سے اندر پناہ گزینوں کے طور پر پڑے ہیں۔ ان میں اکثریت "ہوتو" (Hutu) قبیلہ کی ہے جو اس بدترین خانہ جنگی میں شکست کھا گئے ہیں، جس میں مخالف قبیلہ "توتسی" کے لگ بھگ دس لاکھ افراد کا قتل عام کیا گیا۔ "ہوتو" کو روانڈا سے ملک بدر کرنے والے فتح حاصل کرنے والے توتسی نہیں بلکہ ان کے اپنے حکمران ہیں جنہوں نے اس جنگجو قبیلہ کو منتشر کر کے اس کی طاقت کو ختم کرنا چاہا ہے، مگر انہیں ہیضہ، پیچش، طاعون اور چیچک جیسی بیماریوں نے آلیا۔ فاقوں سے مرنے میں مہینے لگ سکتے ہیں مگر ہیضہ، پیچش اور پیاس سے مرنے میں بہت تھوڑا وقت لگتا ہے۔ اس بحران کا بہترین حل ان پناہ گزینوں کی روانڈا واپسی ہے لیکن انہیں اپنے ہی راہنماؤں اور پھر توتسیوں کا، جو اس سے پہلے ان کے سردار تھے، خطرہ ہے۔ توتسیوں نے چار سو سال تک یہاں ڈنڈے کے زور پر حکومت کی ہے۔ بہت سے لوگ اس لئے بھی واپس نہیں جانا چاہتے کہ وہ دوبارہ اس غلامی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

روانڈا کی نئی حکومت کا کہنا ہے کہ وہ مفاہمت چاہتی ہے۔ کامیابی حاصل کرنے والا روانڈا پیٹریاٹک فرنٹ اس کوشش میں سنجیدہ دکھائی دیتا ہے کہ اس کے اپنے فوجی دستوں کے ہاتھوں کسی پر زیادتی نہ ہو۔ اس نے اعتدال پسند "ہوتوؤں" کو ملک کا نیا صدر اور وزیراعظم بھی مقرر کیا ہے، اگرچہ اصل اقتدار فتح حاصل کرنے والے آرمی کمانڈر میجر جنرل پال کاگم (Paul Kagame) کے ہاتھ میں معلوم ہوتا ہے جو توتسی ہے اور نائب صدر اور وزیر دفاع مقرر ہوا ہے۔ گزشتہ ہفتے "کاگم" کا بیان تھا کہ روانڈا سے کسی کو بھاگنے کی ضرورت نہیں، ہم تمام روانڈا والوں کو تحفظ اور استحکام کی ضمانت دیتے ہیں۔ تاہم انہوں نے کہا کہ کچھ لوگوں نے بے شمار خون بہایا ہے، انہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔

زائرے میں جو پناہ گزین موجود ہیں ان میں سے بہت سارے بیرونی امداد پہنچنے سے قبل موت کے منہ میں جا چکے ہوں گے۔ ادھر کئی نعشیں ان کے کھیتوں میں گل سڑ رہی ہیں جنہیں چھوڑ کر وہ بھاگے ہیں۔ روانڈا ایک زرعی ملک ہے اور اسی لاکھ کی آبادی کے لئے خاصا خود کفیل ہے۔ اب جبکہ خانہ جنگی ختم ہو چکی ہے۔ روانڈا کو اگلا سب سے بدترین خطرہ قحط کا ہے۔

ایک نسل پیشتر افریقہ کا مستقبل نہایت شاندار دکھائی دیتا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا ملک نوآبادیاتی تسلط سے آزاد ہوا تو نئے راہنماؤں نے عوام کو خوشحالی اور جمہوریت کی نوید سنائی۔ مشرقی یورپ اور جنوب مشرقی ایشیاء میں تو اس منزل کی طرف کچھ پیش قدمی ہوئی بھی ہے لیکن افریقہ میں ساٹھ کی دہائی کے شروع میں جو امیدیں پیدا ہوئی تھیں وہ نسلی فسادات، بدعنوانی،

غربت اور مایوسی کے اندھیروں میں دم توڑ چکی ہیں۔ شکست و ریخت کا یہ عمل کہیں بھی اس قدر بھیانک طور پر سامنے نہیں آیا جتنا روانڈا میں ایک دم ابھرا ہے' جہاں صدیوں کی قبائلی دشمنی اس سال موجودہ صدی کی بدترین انسانی تباہی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ دوسرے ایسے ممالک صومالیہ' لائبیریا اور زائرے میں صرف یہ ہوا کہ حکومتوں کی موجودگی معدوم ہو گئی ہے۔ بے روک ٹوک ایڈز' بڑھتی ہوئی آبادی اور گرتے ہوئے معیار زندگی نے ویسے تو کینیا اور زمبابوے جیسے مضبوط ممالک کو بھی اندر سے کھوکھلا کر رکھا ہے اور کہا جاتا ہے کہ افریقہ کا کوئی ملک بھی ایسا نہیں جو راتوں رات زمین بوس ہونے والا نہ ہو۔

افریقہ کا بیشتر حصہ ابھی تک نو آبادیاتی نظام کے لگائے گئے زخم چاٹ رہا ہے۔ انیسویں صدی میں یورپی سامراج نے اس خطے کی جو صورت گری کی اس نے قدرتی قبائلی اور سیاسی سرحدوں کو درہم برہم کر دیا۔ کیونکہ ان کے پیش نظر صرف اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل تھی۔ حالانکہ ان میں سے کوئی ایک بھی قابل عمل ریاست تشکیل نہیں پائی۔ سامراجی حکمرانوں نے تفرقہ پیدا کرنے اور انہیں اپنی رعایا بنانے یعنی divide and rule کا نظریہ اپنائے رکھا اور نسلی تناؤ کی افزائش کی۔ اس کی نمایاں مثال روانڈا اور برونڈی ہیں جہاں بلجیم نے توتسی ممتاز شخصیات کو آگے لا کر "ہوتو" اکثریت کا ناک میں دم کئے رکھا۔ نائیجیریا میں شمال کے ہاؤسا (Hausa) اور فلانی (Fulani) قبائل نے برطانوی شہ پر جنوب کے قبائل کو کئی دہائیوں تک دوسرے درجے کے شہری بنائے رکھا اور ملک کی تیل کی دولت لوٹتے رہے۔

آزادی کے بعد بھی مغرب کی ریشہ دوانیاں ختم نہیں ہوئیں جس سے بدترین قسم کی قبائلی دشمنی نے جنم لیا۔ لائبیریا' صومالیہ' روانڈا اور زائرے جیسے قبائل میں منقسم ممالک میں ایک سپر پاور کی پشت پناہی میں طویل آمریت کا دور رہا جس میں نسلی کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ صومالیہ اور لائبیریا میں امریکی حمایت یافتہ آمروں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کئے رکھا لیکن ۱۹۹۰ء میں امریکہ نے اپنا ہاتھ کھینچا تو دونوں ممالک میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ روانڈا میں فرانس نے توتسی باغیوں کے خلاف "ہوتو" اکثریت پر مبنی فوج اور سول ملیشیا کو مسلح کیا۔

افریقہ کے بہت سے بدبخت اور کوتاہ نظر سیاسی/ راہنما بھی نسلی منافرت کو ہوا دینے اور افلاس کے ذمہ دار ہیں جو ریاست کو اپنے ذاتی مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہاں کبھی بھی یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ ملک کو مضبوط اور باوقار بنایا جائے۔ زائرے کے موبوتو' کینیا کے ڈینیل اراپ موئی یا نائیجیریا کی فوجی حکومت ان سب نے قومی دولت لوٹ کر اپنا گھر بھر لیا۔ موبوتو نے ایک اندازے کے مطابق پانچ بلین ڈالرز غیر ملکی بنکوں میں بھر رکھے ہیں۔

مغربی ممالک کی ہوشیاری یا طوطا چشمی ملاحظہ کیجئے۔ لوٹ کھسوٹ اور جبر و استبداد کے دور میں حکمرانوں کی پیٹھ ٹھونکنے میں پیش پیش رہتے ہیں لیکن جونہی کوئی کڑا وقت آتا ہے فوراً پیٹھ دکھا جاتے ہیں۔ روانڈا میں مہینوں نسل کشی کی مہم جاری رہی جس میں دس لاکھ سے زائد انسانوں کا قتل عام کیا گیا جبکہ' بیس لاکھ سے اوپر لوگ پناہ کی تلاش میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر امریکہ اور یو این او خاموش تماشائی بنے رہے۔ کمیونزم سے نجات دہندہ امریکہ اس بربادی اور تباہی میں بالکل الگ تھلگ کھڑا ہے جس کا افریقہ کے پاس کوئی علاج نہیں۔ کیونکہ اب یہی کھیل' جو روانڈا میں کھیلا گیا' ہمسایہ ملک برونڈی میں کھیلا جانے والا ہے۔ زائرے کے راستے دھڑا دھڑ اسلحہ اور گولہ بارود وہاں پہنچ رہا ہے۔

یہ آفت صرف روانڈا پر ہی نہیں آئی۔ نو آبادیاتی نظام اور سرد جنگ کے خاتمے نے ترقی پذیر ممالک کو ایک نئی تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک تازہ رپورٹ کے مطابق درجنوں ممالک ایسے ہیں جو زمین بوسی کے منتظر ہیں۔ صرف دنوں' مہینوں کی بات ہے اور اس کا سب سے اہم سبب وہ مصنوعی سرحدی لکیریں ہیں جو سامراجی حکمرانوں نے اپنی منفعت اور مفاد کی خاطر کھینچی تھیں۔ اس کے نتیجے میں گزشتہ پانچ سال میں دنیا کے ایک کروڑ کے لگ بھگ انسان گھروں سے بے گھر ہو چکے ہیں اور لاکھوں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

نو آبادی نظام کا دور کہا جاتا ہے کہ گزر چکا ہے اب کوئی بھی اسے اس شکل میں واپس لانے کا خواہش مند نہیں' نہ ہی کوئی یہ الزام اپنے سر لینا چاہتا ہے کہ وہ سامراجی عزائم رکھتا ہے لیکن دنیا جس طرف جا رہی ہے اسے آپ "نئے نو آبادیاتی نظام" کا نام دے سکتے ہیں۔ تو یہ نیا استعمار کون ہے؟ ان کے ہاتھ میں بندوق کی بجائے کیلکولیٹر ہوتا ہے۔ وہ فوجی وردی کی بجائے کاروباری لباس زیب تن کرتے ہیں اور وہ آزاد منڈی کی معیشت کی تبلیغ کرتے ہیں نہ کہ مشنری مذہب کی۔ عطیات دینے والی عالمی برادری کے ممبر ممالک نیا سامراج ہیں اور ان کا ہتھیار ورلڈ بنک اور آئی' ایم' ایف ہیں لیکن اس میں مغربی سفارت خانوں سے لے کر کمرشل بنکوں تک تمام سرکاری و غیر سرکاری ادارے سرگرم عمل ہیں۔ بغیر کسی بینڈ باجے یا گولی چلائے کے انہوں نے ترقی پذیر ممالک کو اپنے چنگل میں جکڑ لیا ہے یہ کامیابی اس سے کہیں زیادہ بڑی اور دقیق ہے جو کسی فوجی طاقت سے حاصل ہو۔ کوئی ملک جتنا کمزور ہو گا اتنا ہی وہ نئے سامراجی شکنجے میں جکڑا ہو گا۔ آئی ایم ایف کی مثال ایک آدم خور کی ہے جو اپنے بچوں کو ہڑپ کر جاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کینسر کی مانند ہے کیموتھراپی لینا بند کر دو گے تو پتہ صاف ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ نیا استعمار اپنی حرکتوں سے باز آ سکتا ہے؟ اس کا کوئی امکان نہیں۔ ورلڈ بینک کے ایک اعلیٰ عہدیدار کا کہنا ہے کہ آپ ایک مریض کو کیسے چھوڑ کر جا سکتے ہیں جو جاں بہ لب ہو اور ایسے مریضوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

استعماریت پسندی ہزار منفعت بخش اور دل خوش کن سہی' مگر اس میں محنت اور خطرات بھی بہرحال ہیں۔ جیسے امریکہ کو رسوا ہو کر جلد ہی واپس جانا پڑا لہٰذا یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ وہ کیا شے ہے جو ان ممالک کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی اور وہ دوسرے ممالک میں جا کر خطرات مول لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک پیش ہے۔

"وال فلاور"۔ (پرانی دیواروں اور چٹانوں پر ایک خوبصورت خودرو پھول)

بعض اقوام جبلی طور پر یا تاریخی پس منظر کی بنا پر مہم جو واقع ہوئی ہیں' خاص کر جب ان کے پاس طاقت بھی ہو۔ دو کلاسک قسم کی طاقتیں دوسری جنگ عظیم میں مار کھائی ہوئی جرمنی اور جاپان کی ہیں۔ دونوں نے حال میں مداخلت کے میدان دوبارہ قدم رنجہ فرمایا ہے۔ جاپان نے اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کمبوڈیا میں اور جرمنی نے صومالیہ میں۔ اگرچہ ماضی کی تلخ یادوں کے زیر اثر دونوں اپنی فوجیں باہر بھیجنے سے ابھی ہچکچا رہے ہیں' میکسیکو ایک اور پیدائشی "وال فلاور" ہے۔ یہی معاملہ سوئیزر لینڈ کا ہے۔ جنوبی افریقہ اس میدان میں نووارد کی حیثیت سے داخل ہو سکتا ہے۔ سپین بھی وال فلاور تھا اب نہیں رہا۔ انتہائی ڈرپوک برطانیہ بھی "وال فلاورز" کی

صف میں شمولیت اختیار کر سکتا ہے۔

جب بھی کوئی قوم دوسرے کسی ملک میں داخل ہوتی ہے اس کا ایک ہی نعرہ ہوتا ہے کہ اس سے وہاں کے عوام کی بدحالی دیکھی نہیں جاتی یا پھر یہ کہ اس خطہ میں "استحکام" کی ضرورت تھی۔ آپ کو ایک سادہ سا اصول بتا دیتے ہیں۔ اگر یہ دعویٰ کینیڈا' آسٹریلیا یا سکنڈے نیوین ممالک میں سے کسی کا ہو تو بے شک اعتبار کر لیں' ہو سکتا ہے یہی بات ہو ورنہ جو بھی یہ بات کہے اسے منہ توڑ جواب دیں۔ گزشتہ ماہ فرانس کی روانڈا میں مداخلت اپنی "عظمت" جتلانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

دوسرے ممالک میں مداخلت کے لئے یہ طریقہ سب سے زیادہ عام رہا ہے کہ کسی ملک پر فوجی طاقت کے ذریعے قبضہ جما لیا جائے اور اس کی دولت سے ہاتھ رنگے جائیں۔ مگر اب سوائے فرانسیسیوں کے دنیا کا کوئی ملک بالکل اس طرح سے قبضہ کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ فرانس نے اپنی سابقہ نوآبادی چاڈ میں ۱۹۹۲ء میں اپنی فوجیں اتار دی تھیں۔ اگرچہ وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کام میں اکیلا نہ ہو' دوسرے یورپی ممالک بھی یہی رنگ اپنائیں۔

یہ لوگ زیادہ دور نہیں جاتے بلکہ اپنے "اہم مفادات کے تحفظ" کے لئے ہمسایہ ممالک پر وار کرتے ہیں جس کی مثال ۱۹۶۵ء میں ڈومینیکن ری پبلک اور ۱۹۸۵ء میں پانامہ پر امریکی حملے تھے۔ اس کی تازہ مثال کا کیشیا میں روسی مداخلت ہے۔ بھارت کے منہ کو بھی ۱۹۸۰ء میں سری لنکا' مالدیپ پر قبضہ کر کے یہ چسکا لگ چکا ہے۔

مغرب کی روشن خیالی تسلیمہ نسرین کو تحفظ فراہم کر سکے گی؟

بنگلہ دیشی حکومت ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہے کہ اگر تسلیمہ نسرین قرآن کے بارے میں اپنے گستاخانہ رویہ کی پاداش میں انتہا پسند مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوتی ہے تو یہ اس کا اپنا کیا دھرا ہے۔

تیس سالہ نسرین' جس کی تحریروں سے قدامت پسند بنگلہ دیشی غضب ناک ہو رہے ہیں' ان جنونیوں سے اس وقت کہیں روپوش ہے جنہوں نے دس ہزار ڈالر اس کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی ہے۔ حکومت اسے تحفظ فراہم کرنے کی بجائے الٹا اپنے طور مذہب کی توہین کے الزام میں اسے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔

گزشتہ ہفتے واشنگٹن میں بنگلہ دیشی سفیر نے اس سے انکار کیا کہ اس کی حکومت نسرین کے معاملے میں بنیاد پرستوں کے سامنے بے بس ہے۔ تاہم انہوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ توہین مذہب کے خلاف سزائے موت کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے جس پر ان کی حکومت غور کر رہی ہے۔

کٹر بنیاد پرست جو اسلامی دنیا میں روز بروز زور پکڑتے جا رہے ہیں نسرین کے معاملے میں اپنے رویہ کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ یہ ان کے ایمان کا تقاضا ہے حالانکہ تیرہ سو سال تک اسلام کو کبھی بے حرمتی کا مسئلہ پیش نہیں آیا اور آج بھی اسے نسرین کی ادبی حماقتوں کے باعث اتنا خطرہ درپیش نہیں جتنا ان اذیت پسندوں کی زیادتیوں سے ہے۔

بنگلہ دیش ہو یا کوئی دوسرا مسلمان ملک' بنیاد پرست انتہا خدا ترسی کو فروغ نہیں دے رہے جتنی ان کی نظریں اقتدار کے حصول پر ہیں۔ دوسری سیاسی جماعتوں میں اور ان میں صرف اسلام کے نعرے کا فرق ہے۔ قرآن جس تحمل اور بردباری کی تعلیم دیتا ہے اسے چھوڑ کر انہوں نے اپنا اسلام الگ گھڑ لیا ہے۔ پارسائی کا لبادہ اوڑھے یہ کم ہمت طبقہ تشدد کے راستے پر پڑ کر اسلامی معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کرنے کا باعث بن رہا ہے۔

یہ تشدد صرف جسمانی ہی نہیں اس کا نشانہ ذہن بھی ہیں تاکہ صدیوں سے اسلامی معاشرے پر جو جمود طاری ہے وہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ روایت پرستی اور تہذیبی جمود میں جہاں کہیں بھی دراڑ پڑنے لگی ہے' شدت پسند آگے بڑھ کر اسے وہیں بند کر دیتے ہیں۔

۱۹۹۲ء میں ایک تخلیقی ذہن رکھنے والے مصری اسلامی مفکر فراغ فودہ کو قتل کیا گیا۔ الجزائر میں دانشور اور شاعر قتل ہوئے۔ ترکی میں صاف گو صحافی ان کا نشانہ بنے۔ نسرین اور اس سے پہلے سلمان رشدی کے واقعہ میں مسلمان دانشوروں کی خاموشی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انتہا پسندی کس طرح فروغ پا رہی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیکولر سیاست' جس کی یہ بنیاد پرست مذمت کرتے ہیں' مسلمانوں کے لئے مایوسی کا باعث ثابت ہوئی ہے۔ سامراجیت کے خاتمہ کے بعد مسلمان حکومتوں کو آبادی میں اضافے اور ترقی میں رکاوٹوں نے سانس نہیں لینے دیا جس میں ان حکومتوں کی اپنی نااہلی اور بدعنوانی نے مزید بگاڑ پیدا کر دیا۔ اس سے ایک نیا طرز فکر سامنے لانے کی ضرورت کا احساس ہوا جس سے بنیاد پرستوں نے بڑی تیزی سے فائدہ اٹھایا۔

لیکن ان کے پاس سوائے اسلام کے نعرے کے عوام کے لئے کچھ نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ اقتصادی مسائل کا کوئی حل دریافت کریں' الٹا برسر اقتدار آ کر جمہوریت کا قلع قمع کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ معاشرے کو نسرین جیسے گند سے پاک کرنا ضروری ہے لیکن اس طرح کیا عوام کی غربت بھی دور ہو جائے گی جو بنگلہ دیش کا سب سے اہم مسئلہ ہے؟

بنگلہ دیش کے سفیر کا کہنا تھا کہ دنیا کو نسرین کے مسئلے پر اتنی بے چینی کیوں ہو رہی ہے؟ لیکن یو۔این کا حقوق انسانی کا موجودہ اعلامیہ نسرین کو اظہار رائے کی آزادی دیتا ہے۔ اس لئے دنیا بنیاد پرستوں کا یہ حق تسلیم نہیں کر سکتی ہے کہ ان کے متشددانہ اسلامی قوانین کو یو این او کے تحت دیئے گئے حقوق پر سبقت حاصل ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی کا مرکز و محور انسانی حقوق کی تائید ہے' جسے سویت یونین اور حال ہی میں ڈرتے ڈرتے چین کے خلاف استعمال کیا گیا (جہاں مزاحمت کا سامنا کرنے پر پسپائی اختیار کر لی گئی) لیکن اسلامی بنیاد پرستوں کے خلاف کارروائی میں کلنٹن انتظامیہ پس و پیش سے کام لے رہی ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ نسرین ان حقوق سے محروم ہے جو کمیونزم سے اختلاف رکھنے والوں کو حاصل ہیں۔

بعض بنیاد پرستوں کا اصرار ہے کہ سویت یونین کے خاتمہ کے بعد مغرب نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے بنیاد پرستی کا ہوا کھڑا کیا ہے۔ یہ محض اصل مسئلے سے توجہ ہٹانے کے لئے ہے۔ اس میں کسی مذہب یا اس کی تشریح کا جھگڑا نہیں' جھگڑا اس ریاکاری سے ہے جس سے کام لے کر انتہا پسند اپنی وحشیانہ کارروائیوں کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلامی انتہا پسندی کا نقصان صرف مسلمانوں تک محدود نہیں' کئی ممالک ایسے ہیں جہاں حقوق

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

ایک "تازہ" و غیر مطبوعہ تحریر جو ربع صدی پہلے لکھی گئی

ہماری قوتِ برداشت جواب کیوں دے گئی؟

اب شاید صرف دعا کی گنجائش باقی ہے

احمد ندیم قاسمی

میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کی خدمت میں آج سے قریب قریب ربع صدی پہلے کی اپنی ایک تحریر پیش کر رہا ہوں--- صرف یہ واضح کرنے کے لئے کہ جمہوری لحاظ سے ہم نے نہ صرف کوئی ترقی نہیں کی بلکہ ہم ایک عمل معکوس کی زد میں ہیں۔ ربع صدی کی طویل مدت بھی ہماری کوئی اصلاح نہیں کر سکی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جب کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مہذب ہے' تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اسے سلیقے کے ساتھ اظہار کا ڈھب آتا ہے۔ اظہار کے مختلف پہلو ہیں۔ ایک اظہار اتفاق ہوتا ہے' ایک اظہار اختلاف ہوتا ہے' ایک اظہار ذات ہوتا ہے جس کا تعلق نہ کسی کے ساتھ اتفاق سے ہوتا ہے نہ اختلاف سے۔ مگر یہ امر طے ہے کہ ہر شخص جب اظہار کرتا ہے تو بزعم خویش اظہار حق کرتا ہے۔

جمہوری نقطہ نظر سے ہر شخص کو اظہار حق کا اختیار حاصل ہے مگر حق الزام اور دشنام اور طعن و تشنیع سے مسلح نہیں ہوا کرتا۔ اگر کوئی فرد الزام و دشنام کے بغیر اظہار حق پر قادر نہیں ہے تو اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ وہ حق پر نہیں ہے۔ اسے اپنی سوچ پر اعتماد نہیں ہے۔ وہ بے یقینی کا شکار ہے اس لئے اپنے ڈھیلے ڈھالے افکار میں دشنام کی کھپیاں لگاتا ہے۔ وہ اپنے لبوں سے الفاظ کے پھول نہیں گرا سکتا اس لئے جھاگ برساتا ہے۔ اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دیتی اس لئے ساتھ ساتھ پٹاخے بھی چھوڑتا جاتا ہے "اس گویے" کی طرح جسے اپنے گلے پر اعتماد نہیں ہوتا تو ہارمونیم کو سب سے اونچے سر میں بجاتا ہے' اور یوں اپنے فن کی ننگی ہوئی پسلیوں کو قباؤں اور لبادوں میں چھپاتا ہے۔

اہل پاکستان کو اظہار کی اتنی وسیع آزادی کا تجربہ بار بار کے مارشل لاؤں کے بعد حاصل ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اہل پاکستان کو اپنے مہذب اور متمدن ہونے کا عملی مظاہرہ کرنے کا موقع ملا ہے۔

..... مگر کیا ہم اپنی تہذیب کا اچھا مظاہرہ کر رہے ہیں؟ کیا ہم نے آزادی اظہار کی اس مہلت سے مثبت فائدہ اٹھایا ہے؟ کیا ہم اظہار حق کرتے ہوئے صرف حق بات کہتے ہیں یا گالیوں پر اتر آتے ہیں؟ کیا ہمیں اپنے مخالف کو برداشت کرنے کا سلیقہ آتا ہے؟ ہماری بحث کا معیار دانشورانہ ہے یا بھٹیارنوں کا سا؟ ہم دلیل کے ذریعے مقابل کے ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا لاٹھی کے ذریعے اس کا سر پھوڑ دینے کے درپے رہتے ہیں؟ سوالوں کی صورت میں یہ چھوٹے چھوٹے آئینے میں نے ارباب اظہار کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اگر وہ ان میں جھانکنے کا حوصلہ فرماسکیں تو اس میں نہ صرف ان کے ذاتی تہذیبی معیاروں کا بھلا ہے بلکہ قوم و ملک کا بھی بھلا ہے۔

یہ جو ہماری سیاست میں "تھڑدلے پن" کا مظاہرہ عام ہو رہا ہے' تو ہمارے کردار کا یہ پہلو کم سے کم ایک جمہوری معاشرے کے تقاضوں کے تو قطعاً مطابق نہیں ہے۔ جمہوریت کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کے تحت ہر فرد اور ہر گروہ کو اظہار کا حق حاصل ہے۔ اظہار اختلاف ہی کے ذریعے اہل ملک کے سامنے ہر مسئلے کی تصویر کے دونوں رخ واضح ہو کر آجاتے ہیں۔ تب وہ بھی اس مسئلے کے بارے میں کسی حتمی فیصلہ تک پہنچ سکتے ہیں اور خود رہنماؤں اور کارکنوں کو بھی' بشرطیکہ وہ دیانت دار ہوں' اپنے نقطہ نظر میں اصلاح کا موقع ملتا ہے۔ جمہوریت میں رد و قبول کا یہ سلسلہ متواتر جاری رہتا ہے مگر خوب سے خوب تر کی طرف کے اس سفر میں رکاوٹ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ارباب سیاست اظہار کے معاملہ میں تہذیبی معیاروں کو ترک کر دیتے ہیں اور زبانوں سے خنجروں کا کام لینے لگتے ہیں۔ اس عالم میں اگر کوئی شخص اس گمان میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ اس قدر غیر مہذب انداز اظہار کی "جمہوری آزادی" برت کر جمہوری قدروں کو فروغ دے رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ جمہوریت کی ابجد سے بھی نابلد ہے اور وہ جمہوری آزادی کے اس عاقبت نااندیشانہ اور کم ظرفانہ استعمال سے دراصل آپا دھاپی اور نراج کا معاشرہ تخلیق کر رہا ہے۔.....

ایک ایسا معاشرہ جس میں جملے نظریوں کی بجائے گردنوں پر ہوتے ہیں اور لوگ منطق و دلیل سے لیس ہونے کی بجائے چاقوؤں اور چھروں سے لیس ہونا بہتر سمجھتے ہیں۔ تب ایک ایسا شخص یا گروہ جسے منہ پھاڑ کر گالی دینے کا ملکہ حاصل ہے بلکہ جو گالیوں کی گردان کر سکتا ہے' خود کو معاشرے کا سب سے جری فرد یا طبقہ سمجھنے لگتا ہے۔ نتیجتاً جمہور کی ذہنیت بھی متاثر ہوتی ہے اور ان کے معیار بھی متغیر ہونے لگتے ہیں۔ ان کی داد و ستائش کی سطح بھی کچھ اس قسم کی ہو جاتی ہے کہ "سبحان اللہ قدرت نے موصوف کو بے خوفی کے ساتھ مقابل کو کھری کھری گالیاں سنانے کی کتنی قوتیں ودیعت کی ہیں" بدقسمتی سے ہمارے ہاں اظہار کے تہذیبی معیاروں کو اسی سطح پر اتار لے جانے کی بھرپور کوششیں جاری ہیں۔ مشکل ہی سے حزب اختلاف کے کسی ایسے سیاسی لیڈر کا نام لیا جاسکتا ہے جس نے الزام و دشنام سے دامن بچایا ہو اور اظہار

محترم احمد ندیم قاسمی نے مدیر کے نام دعاؤں کے ساتھ اپنے گرامی نامے میں لکھا ہے کہ "چند ہفتے قبل آپ نے ایک تقریب میں شکایت کی تھی کہ "ندائے خلافت" کی باقاعدہ ترسیل کے باوجود میں نے اس کے ساتھ قلمی تعاون نہیں کیا۔ میں آپ کی توجہ کا ممنون ہوں مگر آپ کا ہفت روزہ بیشتر دینی مسائل پیش کرتا ہے اور میں محض ایک شاعر اور کہانی کار۔ مگر آپ کی شکایت سن کر ندامت کا احساس یقیناً ہوا۔ بطور تلافی اپنا ایک ربع صدی پرانا مختصر مضمون بھیج رہا ہوں۔ محض یہ سوچ کر کہ جو کچھ میں نے تب عرض کیا تھا وہ اب بھی مبنی بر حقیقت ہے۔ اگر آپ اسے درج کر دیں تو ممنون ہوں گا۔ اگر کسی وجہ سے اسے ناقابل اشاعت سمجھا جائے تو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

ان کی وہ پرانی تحریر بطور تبرک شائع کرتے ہوئے گزارش ہے کہ ہر بھلی بات (قول معروف) آپ کے اور ہمارے دین کا حصہ ہے۔ آپ کی یہ باتیں بہت حکیمانہ ہیں اور حکمت و دانائی اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق مؤمن کی متاع گم گشتہ ہے' جہاں سے بھی ملے اسے حاصل کرنے کا سب سے فائق حق ہمارا ہی تو ہے ——— مدیر

اختلاف کو صرف عقلی دلائل تک محدود رکھا ہو۔ تدارک صرف اس طرح ممکن ہے کہ ارباب سیاست اظہار اختلاف کو صرف دلیل و منطق تک محدود رکھیں اور دلیل و منطق کی بات کہنے کے علاوہ سننے کی بھی اپنے اندر اہلیت پیدا کریں۔

اگر ماضی میں کسی سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا غیر مبہم اعتراف بھی کتنی ہی تلخ بحثوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرسکتا ہے۔ کشیدگی وہاں پیدا ہوتی ہے جب ماضی کی اس غلط روش کی تاویلیں کی جانے لگتی ہیں مگر یہ تاویلیں بیکار ہوتی ہیں۔ اینٹ کے ایک ٹکڑے کو کسی بھی تاویل سے سنگ مرمر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اظہار اختلاف کرنے والے خود تنقیدی اور خود شناسی کے اس مرحلے میں سے گزر سکیں تو جس رجحان سے آج ہمارا معاشرہ آلودہ ہو رہا ہے اسے بر وقت ختم کیا جاسکتا ہے مگر سیاسی سطح پر جو ہنگامہ چار طرف بپا ہے' اس میں میری اس پکار پر کون کان دھرے گا۔ یوں سمجھئے کہ میں یہ سطور محض اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آنے والی نسلیں جب اپنے اسلاف کا موازنہ کرنے بیٹھیں تو اس فیصلے تک نہ پہنچیں کہ وہ لوگ سب کے سب بلا استثناء بد زبان تھے۔

سیاست کی یہ بد زبانی اور بے لگامی ہمارے ہر شعبہ حیات پر اثر انداز ہونے لگی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح گندم کے نرخ ہمارے ہاں دیگر ضروریات زندگی کے نرخ متعین کرتے ہیں' اسی طرح سیاست کے رجحانات ہی سے دیگر شعبہ ہائے حیات میں ہمارے رجحانات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سیاسی گالی گلوچ کا اثر دوسرے شعبوں کے علاوہ ہمارے بعض ارباب تعلیم اور ارباب ادب تک پر بہت نمایاں طور سے پڑ رہا ہے۔ ان حضرات کے انداز تحریر سے ظاہر ہے کہ اگر انہوں نے کسی کی پگڑی اچھال دی تو بزعم خود انہوں نے اپنے علم و ادب کے مطالبات کا حق ادا کردیا۔ صرف ارباب تعلیم ہی کو لیجئے کہ اگر وہ نئی نسل کے سامنے اپنے کردار و افکار کا یہی گھناؤنا نمونہ پیش کرتے رہے تو وہ نئی نسلوں کی ذہنیتوں کا بیڑا غرق کردیں گے۔ نوجوانوں کے ذہنوں کی تشکیل و تعمیر کو ایسے بد زبان اور دریدہ دھن عناصر کے سپرد کرنا' بندر کے ہاتھ میں استرا تھما کر اپنے بچوں کے چہروں پر سے مکھیاں اڑانے کے کام پر مامور کرنے کے مترادف ہے۔ ایسے عناصر کو تعلیم کی بجائے سمگلنگ اور چور بازاری ہی زیب دیتی ہے اور وقت آگیا ہے کہ وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں قدرت نے ہماری نسل کے مستقبل کی امانت دے رکھی ہے' ان اخلاق باختہ عناصر کا مواخذہ کریں اور معلوم کریں کہ انہوں نے اپنے مقدس قلم کو جس زہر میں ڈبو رکھا ہے' وہ انہوں نے کہاں سے حاصل کیا ہے؟ وہ کون سی مصلحتیں اور مجبوریاں ہیں جنہوں نے ان لوگوں کو معلم کے اعلیٰ منصب کے ساتھ اتنی بد سلوکی کرنا سکھائی ہے؟ انہیں شہ کن غیر ملکی عناصر کی طرف سے مہیا ہوتی ہے اور وہ ان پست خدمات کی کتنی قیمت وصول کرتے ہیں؟۔

مگر یہ تطہیر اس وقت تک مشکل ہے جب تک ہمارے ارباب سیاست اپنے معیاروں کی اصلاح نہیں کرتے۔ جب ان کا سکہ رائج الوقت ہی گالی گلوچ اور طعن و تشنیع ہو تو اہل علم کو اس فیشن کی متابعت کرنے سے کون روکے۔ اور اس وقت بیشتر ارباب سیاست کے پیش نظر تہذیب' تمدن اور تحریر و تقریر کے معیاروں کا نکھار نہیں ہے بلکہ آئندہ کا اقتدار ہے۔ جمہوری نظام میں اقتدار کی خواہش بری چیز نہیں ہے' مگر جب اس خواہش کی شدت انسان سے' اس کی آنکھوں اور کانوں کے علاوہ' اس کا ذہن اور ضمیر بھی چھین لے تو پھر صرف دعا کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ ○○

اس میں "را" کا ہاتھ ہے تو حکومت "بے دست و پا" کیوں ہے؟

نجیب صدیقی

کراچی پھر فساد کی لپیٹ میں

بگاڑ کی اصلاح کے اصل طریقے کی طرف کسی کی توجہ نہیں

کراچی جو کبھی امن کا شہر ہوا کرتا تھا' جسے روشنیوں کا شہر بھی کہتے تھے' آج اس کی ہر گلی کوچے میں موت کا رقص جاری ہے۔ گولی چلنے کی آواز سنتے ہی لوگ اپنی دکانیں بند کرکے بھاگتے ہیں' گھروں میں دبک جاتے ہیں اور تھوڑی دیر میں ہو کا عالم ہوجاتا ہے۔ ان گنت ڈکیتیاں اور چوریاں تو روز کا معمول ہیں۔ اسلحہ کے زور پر گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں چھیننے کی وارداتوں پر اب حیرت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ ان دنوں اس فساد نے ایک نئی صورت اختیار کی ہے۔ انتہائی مشاق اور تربیت یافتہ گروہ حرکت میں آگیا ہے۔ یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ نادیدہ ہاتھ یہ چاہتا ہے کہ شیعہ' سنی فساد کے ذریعہ کراچی کی یکجہتی کو پارہ پارہ کردیا جائے' اور جھگڑے کی ایک مستقل بنیاد ڈال دی جائے۔ حکومت کہتی ہے کہ اس میں "را" ملوث ہے۔ عوام کہتے ہیں کہ حکومت ملوث ہے۔ حکومت اس شہر کو بکھیر کر اپنے انداز پر چلانا چاہتی ہے۔ ایسے منظم حملے کے لئے کوئی منظم قوت درکار ہے۔ اس قوت کو اس بات کا خوف نہیں ہے کہ وہ پکڑی بھی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اس گروہ کا ایک فرد بھی پکڑا نہیں گیا۔ نصف شب کا وقت ہے کچھ لوگ عبادت کے بعد اپنے گھروں کو جا رہے ہیں' ان میں جوان بھی ہیں بچے بھی' ان پر گولیوں کی بارش کردی جاتی ہے۔ ڈرائیور اگر بس کو لے کر نہ بھاگ جاتا تو شاید ایک فرد بھی زندہ نہ بچتا۔ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ اتنے سفاک کیوں ہیں؟ مذہبی جنون بھی اتنی سفاکی پر مجبور نہیں کرتا۔ پھر اکا دکا واردات کا ہونا الگ بات ہے۔

ان واقعات کا تسلسل یہ بتاتا ہے کہ اس کی پشت پر منظم پلاننگ ہے اور اس کے کچھ دوسرے ہی مقاصد ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ تجزیہ کرتا اور سوچتا

ہے۔ بعض لوگ صوبے کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو انہیں یہ نظر آتا ہے کہ کراچی کی یک جہتی توڑ کر اسے مختلف طبقات میں بانٹ دیا جائے اور پھر "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کیا جائے بعض لوگ نیو ورلڈ آرڈر کے حوالے سے کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت امریکہ کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے قدم بہ قدم چل رہی ہے۔ پہلے اس نے ایٹمی صلاحیت کو "رول بیک" کرنے یا "کیپ" کرنے پر راضی ہوئی۔ عوام الناس کو دھوکہ دینے کے لئے خاموش ڈپلومیسی کی اصطلاح وضع کی گئی۔ پھر آئی ایم ایف کے آگے گھٹنے ٹیکے بلکہ گھٹنے توڑ دیئے ہیں۔ پھر حکومت کی طرف سے یہ شوشہ چھوڑا گیا ہے کہ یورپ کی ترقی کا راز چرچ اور سیاست کو الگ کرنے میں تھا۔ پھر دوسرے ہی دن یہ مشورہ دیا گیا کہ علماء سیاست ترک کرکے پڑھنے پڑھانے میں لگ جائیں' سیاست ہم جیسے دنیا داروں کے لئے چھوڑ دیں۔ اس طرح ایک سیکولر معاشرہ کے لئے ذہن ہموار کی جانے لگی۔ جب علماء کی طرف سے اس پر رد عمل آیا تو حکومت نے اب دوسری حکمت عملی اختیار کی ہے۔ عوام الناس کو عقیدے کی بنیاد پر اس طرح آپس میں گتھم گتھا کردو کہ لوگ پکار اٹھیں کہ مذہب نفرت کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے لہٰذا اس رکاوٹ کو دور کرو۔ اس طرح "بنیاد پرستی" کی لہر کو جو اس وقت اسلامی ممالک میں نمایاں طور پر اٹھتی نظر آرہی ہے ختم کیا جاسکے اور اپنے آقا و مالک امریکہ کو راضی کیا جاسکے۔

آخر کیا بات ہے کہ کراچی کے شیعہ سنی مل کر رہنا چاہتے ہیں اور بار بار وہ اس کا اظہار بھی کر چکے ہیں مگر انہیں مل کر رہنے نہیں دیا جاتا۔ جب گھروں سے نوجوانوں اور بچوں کے جنازے اٹھیں گے تو نفرت کی دیوار یقیناً بلند ہوگی اور یہی دیوار نفرت کی ایک مستقل بنیاد بن جائے گی۔ اگر یہ فسادات نیو ورلڈ آڈر کا حصہ نہ ہوتے تو کیا انتظامیہ اتنی بے بس ہے کہ وہ دسیوں قاتلوں میں سے کسی ایک کو بھی گرفتار نہ کر سکتی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد دوسرا راؤنڈ بریلوی' دیوبندی فساد کا شروع ہونے والا ہے تاکہ اس امت کو تقسیم در تقسیم کرکے نیو ورلڈ آڈر کا منشا پورا کیا جاسکے اور بنیاد پرستی کی "لعنت" سے چھٹکارا حاصل کرکے امریکہ کو راضی کیا جاسکے۔

اگر یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ ان فسادات میں "را" کا ہاتھ ہے اور جب ملک میں اس کا تسلسل جاری ہے تو ایسی صورت میں انتظامیہ کو اپنی نااہلی تسلیم کرلینی چاہئے اور دوسروں کو موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنی صلاحیت استعمال کریں۔ پھر کراچی شہر میں تو انتظامیہ کی مدد کے لئے فوج موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں بھی جب ایسے ہولناک واقعات ہوں اور قاتل پکڑے نہ جائیں تو سوائے افسوس اور حسرت کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ پارٹی جب بھی برسراقتدار آئی ہے اس نے لوگوں کو لاشوں کے تحفے دیئے ہیں نیز بڑے پیمانے پر قتل و غارتگری اس کا طرہ امتیاز ہے۔ آج بھی لوگ ان کی برسیاں مناتا کران کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اس پارٹی کے لوگوں کو بھی سوچنا چاہئے کہ ان کی یہ شہرت ان کے وقار میں کتنا اضافہ کرتی ہے۔

کراچی شہر میں فوج کا مزید رہنا اس کی شہرت کو داغدار کرنے کے مترادف ہوگا وہ ایک ایسا ادارہ ہے جس سے قوم کا سر فخر سے بلند ہوتا ہے۔ سندھ کی انتظامیہ اس کی اس بلندی کو پامال کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ شیعہ سنی' دیوبندی بریلوی' یہ ایسے ادارے ہیں جو انتہائی مضبوط عقیدے پر قائم ہیں۔ ان کے درمیان جو فاصلے ہیں انہیں مزید بڑھا کر ملک کی کوئی خدمت نہیں کی جاسکتی نہ ان کے اختلافات ہی ایسے ہیں جو افہام و تفہیم یا تمناکرنے سے دور ہو سکیں۔ یہ اب ان انتہاؤں تک پہنچ چکے ہیں کہ ان کے درمیان فیصلہ اس دنیا میں ممکن نہیں۔ اس دنیا میں مل کر رہنے کے لئے ان فرقوں کے درمیان اتفاق کی راہیں تلاش کرنا ہوگی۔ ان کے اندر قدر مشترک کو اجاگر کرنا ہوگا اور ایک دوسرے کے ساتھ رواداری والا انداز اختیار کرنا پڑے گا۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنا ہوگا۔ اسی میں ان تمام فرقوں کا فائدہ بھی ہے اور ملک کا بھی۔ باہم دست و گریباں رہنے میں نہ ان فرقوں کا بھلا ہوگا نہ ملک کا۔

میرے نزدیک ان فرقوں کے درمیان جو قدر مشترک ہے وہ دین کا قیام ہے۔ وہ دین جس پر شیعہ سنی' دیوبندی' بریلوی اور اہلحدیث بھی متفق ہیں۔ ان کے درمیان نکتہ اتحاد پاکستان میں اس کا نفاذ ہے۔ اس کے نفاذ کے لئے سب کو مل کر جدوجہد کرنی چاہئے۔ اس مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے لئے اپنے اندر' نرم گوشہ پیدا کرنا ہوگا۔ اس مشترک مقصد کے حصول میں جب لگ جائیں گے تو ان شاء اللہ ان کے درمیان فاصلے کم ہوں گے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوچکا ہے۔ پاکستان کے تمام مسالک کے علماء ایک جگہ جمع ہو کر ایک اسلامی دستور کے خاکے پر متفق ہو چکے ہیں۔ وہ روشن نکات آج بھی موجود ہیں۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ملت میں تفریق پیدا کرکے اپنے مقاصد حاصل کرلیں گے اور امریکہ کے نیو ورلڈ آڈر کو اس ملک میں عملی جامہ پہنادیں گے وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ ایسا سوچنے والوں نے تاریخ سے نہ کوئی سبق سیکھا ہے اور نہ قوم کے مزاج کو ہی سمجھا ہے۔ فقہی مسائل پر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے والے جب اسلام کے خلاف کوئی بات سنیں گے تو قدم ملا کر اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ ماضی میں بھی ایسا ہوا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ جب یہ طوفان اٹھ کھڑا ہوگا تو مغربی تہذیب کے "دلالوں" کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔

اس ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل ہونے والا یہ ملک اپنے نظام کو اس کے مطابق چلانے پر تیار نہیں ہوا۔ انگریز چلا گیا لیکن ملک پر "کالے انگریز" کا قبضہ بدستور چلا آرہا ہے۔ غلامی نے اس طبقے کی حریت فکر کو روند ڈالا ہے اور اس کی حمیت کو ختم کر دیا ہے۔ جس طبقے کو اپنا لباس' اپنی زبان' اپنا طرز فکر عزیز نہ ہو وہ اس ملک کے مقصد کی طرف پیش قدمی کیا کر سکتا ہے۔ اس کے غلامانہ ذہن کا پر تو عوام الناس پر پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس طبقے نے عوام الناس کو رنگ رلیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کی مشرقی اقدار رفتہ رفتہ مٹتی جارہی ہیں۔ نئی نسل لہو و لعب میں اس قدر مشغول ہوگئی ہے کہ اسے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کبھی ایک زندہ قوم تھی' اس کے کچھ فکری اثاثے تھے۔ اس کی کچھ قدریں تھیں۔ وہ ایک وقت دنیا میں سربلند تھی۔ دوسری قومیں اس کی تہذیب کو اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ آج وہی قوم گمراہ شدہ قوموں کی نقالی پر فخر محسوس کر رہی ہے۔ یہ سب کچھ ان کالے انگریزوں کے کرتوت ہیں جن کا خمیازہ ہماری قوم نہ جانے کب تک بھگتے گی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک بھرپور تحریک اٹھے جو عوام الناس کو اس کی مضرت سے آگاہ کرے اپنے شاندار ماضی کے خدوخال کو اجاگر کرے' انہیں منظم کرے اور ایک ایسی ناقابل تسخیر قوت بنادے

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں وادئ کلغان میں

ایک بامقصد سفر کی روداد

ابو عمیر مہرانی

خلافت کی اذان کے لئے لوگوں کے کان ترس رہے ہیں

ہمارے عام قارئین کو یہ روداد بہت طولانی معلوم ہوگی لیکن اس کی افادیت کی قدر اصل میں ان معاونین تحریک خلافت پاکستان کو ہوگی جن کے سینوں میں کچھ کر گزرنے کے عزائم بیدار ہو رہے ہیں۔ بالکل اجنبی لوگ قطعی طور پر نئے راستوں پر سفر کرتے ہوئے بھی خلافت کا پیغام عام کرسکتے ہیں۔ راولپنڈی سے تحریک کے ایک کارواں نے ان وادیوں کا رخ کیا جن کا قصد عام طور پر بے فکرے لوگ "سیاحت" کے لئے کرتے ہیں۔ میر کارواں اور ان کے ساتھیوں کو مروان کہستانی سے ملنے کا اتفاق ہوا بلکہ بعض جگہوں پر انہوں نے تحریک خلافت کا بینر دیکھ کر خود اس قافلے کو روکا اور نئی نئی سی باتوں کو اپنے دلوں میں بسالیا... لکھنے والے نے تو اس روداد سفر کو بہت کھینچا تھا... لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم... لیکن ہم نے اسے مختصر کیا جس کے لئے تحریک خلافت راولپنڈی کے ساتھیوں سے معذرت ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا کریں، ہماری تنگ دامنی آڑے آتی ہے

مدیر

نئے دعوتی مراکز کی طرف کار دعوت کی منتقلی تحریکوں کی زندگی میں تاریخی اہمیت کی حامل ہوا کرتی ہے، جہاں سے تحریک کو نیا خون اور ولولہ تازہ میسر آتا ہے۔ اور فی الحقیقت تو قادر و حکیم رب العزت ہی اپنی حکمت و تقویم کے مطابق اسباب و مواقع فراہم فرماتا رہتا ہے۔ خطہ کوہستان کے دعوتی دورہ کا تقاضا تو ایک مدت سے داسو کے رفیق تنظیم سید فقیر صاحب کر رہے تھے لیکن گزشتہ تین ماہ کے دوران جناب محمد جمشید کوہستانی کی طرف سے مسلسل تقاضا ہو رہا تھا، جو کہ حالیہ رمضان المبارک ہی میں معاون تحریک بنے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں راولپنڈی کے متعدد سفر کئے نیز تحریک میں شمولیت کے بعد نہایت سرعت سے انہوں نے دو تین سو کے قریب افراد کو معاون تحریک بنالیا۔ ان کی اس محنت و لگن نے ان کے مطالبے میں مزید وزن ڈال دیا۔ اس طرح پہلے سے زیر غور پروگرام پر مقامی نظم نے اب سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ تنظیمی اجتماعات میں بھی مشاورت کے بعد اس سلسلے میں مثبت رد عمل سامنے آیا۔ اس طرح ناظم حلقہ محترم شمس الحق اعوان صاحب نے اصولی طور پر طے کر لیا کہ ماہ جون میں کوہستان کا پندرہ روزہ دورہ کیا جائے گا۔ اسی اثناء میں ۸ تا ۱۰ اپریل کو راولپنڈی میں تنظیم اسلامی حلقہ شمالی پنجاب کا سہ روزہ علاقائی اجتماع منعقد ہوا۔ اس موقع پر ناظم حلقہ نے مرکزی نظم کو کوہستان کے دورہ اور متعلقہ تفصیلات سے آگاہ کیا۔ یوں علاقائی اجتماع کے اختتام پر کوہستان اور ملحقہ علاقہ جات کے لئے ۱۵ تا ۳۰ جون کے پندرہ روزہ کا اعلان کر دیا گیا۔

پروگرام طے پا جانے کے بعد ایبٹ آباد اور کوہستان کے درمیان واقع تمام اضلاع کے رفقاء و معاونین کو اس دورہ کے متعلق دفتر حلقہ کی طرف سے اطلاعاتی خطوط تحریر کئے گئے۔ نیز مختصر دعوتی ایک ورقہ تیار کر کے بیس ہزار کی تعداد میں چھپوالیا گیا۔

لاہور سے بھی کچھ رفقاء کے آنے کی توقع تھی لیکن آخری دنوں میں تربیتی پروگرام طے پا جانے سے لاہور کے ساتھیوں نے شرکت سے معذرت کرلی۔

لاہور کے رفقاء کے پروگرام کی تبدیلی کے باعث از سر نو انتظامات کی مصروفیت کی وجہ سے روانگی بھی ایک دن موخر کرنا پڑی۔ یوں ۱۶ جون سہ پہر ۲ بجے رفیق محترم محمد نعیم کی امارت میں یہ قافلہ اللہ کی نصرت و حمایت کی دعائیں کرتے ہوئے راولپنڈی سے عازم سفر ہوا۔ شرکاء میں محترم شمس الحق اعوان صاحب ناظم حلقہ، محترم خالد محمود عباسی ناظم حلقہ آزاد کشمیر، مقصود احمد رفیق تنظیم پھالیہ گجرات، رؤف اکبر نقیب اسرہ کینٹ، چوہدری محمد اسلم ممبر مرکزی خلافت کمیٹی، محمد جمشید خان کوہستانی اور راقم شامل تھے۔

پہلا مختصر پڑاؤ مانسہرہ سے متصل نئی آبادی غازی کوٹ میں ہوا جہاں رفیق تنظیم ملک محمد اور نگزیب صاحب سکونت پذیر ہیں۔ وہاں سے چائے وغیرہ پینے کے بعد یہ قافلہ دوبارہ اپنے سفر کی طرف رواں دواں ہوا۔ نماز عشاء سے کچھ دیر قبل چھتر پلین پہنچے، جہاں معاون تحریک دہشت خان سے مل کر رات کے قیام کا بندوبست مقامی جامع مسجد میں کیا گیا۔ دوسرے دن مسجد ہذا میں نماز فجر کے بعد خالد محمود عباسی نے درس قرآن دیا۔ ناشتہ وغیرہ سے فراغت کے بعد دوبارہ عازم سفر ہوئے۔ اور تقریباً پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد ہمارا قافلہ کومیلا پہنچ گیا۔ یہاں کے لئے پروگرام یہ طے ہوا کہ محترم شمس الحق صاحب تین ساتھیوں کے ہمراہ کیلا کی جامع مسجد جائیں گے جہاں خطاب کا موقع مل گیا تو فللہ الحمد، بصورت دیگر نماز کے بعد ہینڈبل تو تقسیم کرنے ہی ہیں جبکہ چار رفقاء کا دوسرا گروپ داسو کی جامع مسجد میں ہینڈبل تقسیم کرے گا۔ مرکزی جامع مسجد کیلا کے خطیب محترم مولانا محمد امین صاحب جے۔ یو۔ آئی کے سابق ایم این اے رہے ہیں۔ جناب ناظم حلقہ سے ان کا تعارف پہلے سے تھا۔ اس سابقہ تعارف کی بنا پر ملاقات ہوئی اور انہوں نے خطبہ جمعہ کی اجازت مرحمت فرمادی۔ مسجد میں حاضرین کا جم غفیر تھا، جس سے جناب شمس الحق اعوان صاحب نے خطاب فرمایا۔ ادھر داسو کی مسجد میں مولانا محمد امین صاحب کے بھائی مولانا محمد جمیل صاحب نے بھی خطاب جمعہ کی اجازت دے دی، خالد محمود عباسی نے یہاں خطاب فرمایا اگرچہ مسجد میں حاضری مختصر تھی۔

نماز جمعہ اور بعد ازاں ملاقاتوں سے فراغت کے بعد تمام ساتھی اکٹھے ہوئے۔ کھانا کھانے کے بعد قیام کی غرض سے مولانا محمد امین صاحب کی مسجد کا قصد کیا۔ نماز عصر کے فوراً بعد شمس الحق صاحب نے موجود نمازیوں سے خطاب فرمایا۔ حاضری چالیس کے قریب تھی۔ اس موقع پر ذاتی ملاقاتوں کے نتیجے میں تین حضرات نے معاونت اختیار کی۔ نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد جمشید خان کے ہمراہ شمس الحق صاحب اور محمد شمیم صاحب ہوٹل زرین' مین بازار کیملا گئے' جہاں جمشید خان نے لوگوں کو اکٹھا کیا۔ شمس الحق صاحب نے تقریباً بیس حضرات کے سامنے دعوت پیش کی۔ لوگوں نے انتہائی انہماک اور لگن سے خطاب سنا۔ نماز عشاء مسجد میں ادا کی گئی اور نماز کے بعد مولانا محمد سعید صاحب' جو کیملا کی ایک معزز شخصیت ہیں' ہماری قیام گاہ میں تشریف لائے۔ ان سے بہت مفید گفتگو رہی۔

اگلے روز یعنی ۱۸ جون نماز فجر کے بعد محمد شمیم صاحب نے درس قرآن دیا۔ چالیس حضرات شریک مجلس تھے۔ ناشتے کے بعد ہمارے معاون سید فقیر' مقامی عالم دین مولانا محمد یوسف ثانی مدظلہ کو ملاقات کے لئے لیکر آئے۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی اس گفتگو کے بعد شمس الحق صاحب نے خالد محمود عباسی اور سید فقیر' مولانا یوسف ثانی کے ہمراہ پٹن روانہ ہو گئے' پٹن جانے کی اصل وجہ وہاں کی بہت بڑی علمی شخصیت مولانا محمد عبدالحلیم مدظلہ سے ملاقات تھی' جو علاقے کے علماء میں نہایت معتبر حیثیت کے حامل ہیں۔ ان سے ملاقات تو نہ ہو سکی چونکہ علاقے کی دیگر آبادی کی طرح وہ بھی جون سے نومبر تک کے عرصے کے لئے پہاڑوں کے پچھلی طرف ٹھنڈی جگہ پر منتقل ہو گئے تھے۔ پٹن کے سفر کا اصل مقصد تو حاصل نہ ہو سکا۔ البتہ یہ سفر بہرے اے سے نتیجہ بھی نہ رہا چونکہ وہاں کی دوسری علمی شخصیت مولانا قاضی عبدالحلیم صاحب سے ملاقات ہو گئی جو کہ جمعیت اشاعت التوحید والسنہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مولانا صوفی محمد صاحب کی تحریک نفاذ شریعت میں نمایاں کام کرتے رہے ہیں۔ شمس الحق اعوان صاحب نے مولانا محترم کے سامنے موجودہ دور کی عمرانی صورتحال اور اختیارات کے مراکز کی گرفت کی کیفیت رکھی۔ اعوان صاحب نے بتایا کہ علاقائی کی بجائے ملک گیر تحریک ہی نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

ادھر کیملا میں راقم اور جمشید خان نے بازار میں عمومی گشت کیا۔ نیز ایک ہوٹل میں مقامی حضرات سے گفتگو کیں کیں۔ الحمدللہ فوری طور پر ۱۴ احباب نے معاونت اختیار کی' جن میں اہم اور موثر شخصیت محمد جاوید صاحب کی ہے جن کی کیملا بازار میں دکانیں ہیں۔ ان ہی کی کوشش سے دیگر لوگوں نے معاونت اختیار کی۔ محترم ناظم حلقہ نے نئے معاون جاوید صاحب سے تفصیلی گفتگو کی۔ جاوید صاحب نے یہاں دعوت کے روشن امکانات سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ لوگ انتخابی کھیل سے کلیتاً متنفر ہیں۔

رات کو مشورہ کے بعد طے ہوا کہ اگلے دن یعنی ۱۹ جون کو نماز فجر اور ناشتے کے بعد چلاس کے لئے روانہ ہوا جائے تاکہ وہاں اگر جلسے کا اہتمام ہو سکے اور محترم جنرل صاحب کو بلوایا جا سکے۔ نماز فجر کے بعد شمس الحق صاحب نے سورہ توبہ کی آیات کے حوالے سے انتہائی موثر و جامع درس دیا۔ دوپہر ایک بجے چلاس پہنچے۔ شریک کاروان چوہدری محمد اسلم صاحب نے اسلام آباد ہی سے تحکمانہ طور پر مقامی ریسٹ ہاؤس میں دو کمرے بک کرا دیے تھے۔ اس لئے ریسٹ ہاؤس ہی میں پڑاؤ کیا۔ بعد ازاں پانچ رفقاء کو دو گروپوں کی شکل میں بازار میں ہینڈ بل تقسیم کرنے کی ہدایت کی گئی جبکہ شمس الحق صاحب اور امیر قافلہ علماء سے رابطہ کے لئے مختلف مساجد میں گئے۔ ہینڈ بل کی تقسیم کے دوران ہماری ملاقات مفتی نور محمد مدظلہ سے ہوئی جو ہماری فکر سے پہلے آگاہ تھے۔ انہوں نے ہماری فکر سے اتفاق کیا۔ بعد کی ملاقاتوں کے نتیجے میں مفتی صاحب نے تنظیم اسلامی میں شمولیت فرمالی۔ اس طرح ہمیں چلاس میں ایک مضبوط بنیاد میسر آ گئی۔

نماز مغرب کے بعد مدنی مسجد میں خطیب مسجد مولانا محمد ایاز صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولانا محترم نے نہایت محبت بھرے انداز میں شمس الحق صاحب کی گفتگو سنی اور نہایت اصرار کرتے ہوئے ہمیں اپنے گھر کھانے کے لئے لے گئے۔ وہاں بھی مولانا صاحب اور دیگر علماء کرام سے شمس الحق صاحب گفتگو کرتے رہے۔ علماء کرام نے نیک جذبات کا اظہار فرمایا۔

۲۰/جون کو صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک پرانا بازار چلاس میں رفقاء کے دو گروپوں نے ہینڈ بل تقسیم کئے۔ اسی دوران گلگت سے تعلق رکھنے والے مقامی پولیس ملازم زمرد خان سے ملاقات ہوئی نیز مقامی ڈاکٹر بہادر خان صاحب سے بھی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے تحریکی کام کو موثر انداز میں چلانے کے جذبات کا اظہار کیا۔

بعد ازاں مقامی صحافی سرتاج لقمان ریسٹ ہاؤس میں آئے اور شمس الحق صاحب نے ان کے سامنے تفصیل سے دعوت پیش کی۔ نیز مسلم لیگ چلاس کے صدر جاوید خان سے محمد شمیم صاحب کی تفصیلی دعوتی گفتگو ہوئی۔ نماز عشاء کے بعد محکمہ زراعت میں ریسرچ آفیسر نظام الدین صاحب سے محمد شمیم صاحب کی مفصل بات چیت ہوئی۔

۲۱/جون کی صبح نماز فجر کے بعد شمس الحق اعوان اور راقم مفتی نور محمد صاحب کے ہمراہ جمعیت اشاعت التوحید والسنہ شمالی علاقہ جات کے امیر مولانا افسر خان صاحب سے ملاقات کے لئے گئے۔ شمس الحق اعوان صاحب نے مولانا کے سامنے تحریکی دعوت مختصراً پیش کی۔ مولانا صاحب نے نیک جذبات کا اظہار کیا۔ بعد ازاں مشورہ سے یہ طے ہوا کہ داسو کے لئے تیاری کی جائے۔ بارہ بجے چلاس سے داسو کے لئے روانگی ہوئی۔ سمرنالہ کے مقام پر کھانے کے لئے مختصر قیام کیا۔ اذان مغرب کے قریب داسو پہنچے۔ داسو میں ہمارا قیام مولانا امین صاحب کی مسجد میں ہی رہا۔ بعد نماز مغرب کے بعد شمس الحق صاحب اور امیر قافلہ و دیگر دو رفقاء کے ہمراہ کیملا کے معروف عالم دین مولانا محمد سعید صاحب سے ملاقات کے لئے ان کی مسجد گئے۔ مولانا صاحب سے ایک ملاقات پہلے بھی ہو چکی تھی۔ انہوں نے تحریک کی دعوت پر مثبت خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معاونت اختیار فرمائی۔

اگلے روز روانگی سے قبل مقامی خلافت کمیٹی کے قیام کا اہم کام پیش نظر تھا۔ اس مقصد کے لئے تمام قافلہ ہوٹل زرین پہنچا۔ اور معاون تحریک محمد جاوید صاحب سے رابطہ کی کوشش کی۔ موصوف کسی کام کی غرض سے کہیں گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس وقفہ کے دوران بازار میں چاکنگ کرنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا لیکن پولیس نے ہمیں چاکنگ سے یہ کہہ کر روک دیا کہ ضلع بھر میں چاکنگ پر پابندی ہے۔ البتہ اعوان صاحب نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے انسپکٹر صاحب کو انہیں ان کی ملی اور دینی ذمہ داریوں سے آگاہ کر دیا۔ بعد ازاں مقامی ایس ایچ او صاحب سے ملاقات کی اور ان تک دعوت پہنچائی۔ باہمی مشورہ سے داسو اور کیملا کے چند ماہ کی عبوری مدت کے لئے مندرجہ ذیل کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ناظم محمد جاوید صاحب' سیکرٹری نمازی خان صاحب' سیکرٹری مالیات محترم شمس الرحمن صاحب

داسو کے قیام کے دوران الحمدللہ سو (۱۰۰) احباب نے تحریک کی معاونت اختیار کی۔ خلافت کمیٹی کی تشکیل کے بعد ایک بار پھر عازم سفر ہوئے اور سہ پہر پانچ بجے کوہستان کی دوسری تحصیل پٹن پہنچے جو کہ شاہراہ ریشم پر ہی واقع ہے۔ وہاں پہنچنے کے فوراً بعد مرکزی جامع مسجد میں نماز عصر ادا کی گئی۔ اور مدرسہ کے دو علماء کرام سے شمس الحق اعوان نے ملاقات کی۔ نیز جناب شمس الحق اعوان نے مولانا سمیع اللہ صاحب سے ان کی مسجد میں جا کر ملاقات کی۔ نماز مغرب تھانہ والی مسجد میں ادا کی گئی۔ درس قرآن کی اجازت مل جانے کے باعث نماز مغرب کے بعد خالد محمود عباسی نے آیات استخلاف کی روشنی میں جامع درس قرآن دیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر فضل الحق صاحب اور مدثر شاہ سے مسجد ہی میں ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر فضل الحق نے شدید اصرار کر کے تمام ساتھیوں کو اپنے گھر کھانے پر بلا لیا۔ کھانے [illegible] ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی سے [illegible] کا قیام تھانہ والی مسجد میں [illegible] نماز فجر کے بعد شمس الحق صاحب نے درس قرآن دیا جب کہ مرکزی جامع مسجد میں اسی وقت شمیم صاحب نے درس قرآن دیا۔ شمس الحق صاحب ڈاکٹر فضل الحق سے ملاقات کے لئے ان کے گھر گئے۔ سات بجے تمام ساتھی مدثر شاہ کی دعوت پر ان کے گھر ناشتے کے لئے گئے۔ مدثر شاہ کے بھائی مزمل شاہ داسو میں ملازم ہیں۔ ہمارے وہاں قیام کے دوران انہوں نے معاونت اختیار کی۔ اسی تعلق کی بنا پر مدثر شاہ سے تعارف ہوا۔ ناشتے کے بعد شمس الحق صاحب نے میزبان اور ان کے برادری کے افراد کے سامنے بھرپور انداز میں دعوت پیش کی۔ اس موقع پر الحمدللہ مزمل شاہ صاحب کے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں سمیت ۹ افراد نے معاونت اختیار کی۔ ڈاکٹر فضل الحق بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے بھی تعاون فارم پر کیا۔ اب چونکہ پٹن میں معاونین کی تعداد گیارہ ہو گئی تھی' اس لئے مقامی خلافت کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کا ناظم ڈاکٹر فضل الحق صاحب' سیکرٹری نادر شاہ صاحب اور ناظم مالیات محمد خان صاحب مقرر ہوئے۔

اس کے بعد پٹن کے بازار میں کارنر میٹنگ کے لئے روانگی ہوئی۔ ڈاکٹر فضل الحق اور جمشید خان نے ذاتی تعارف کے سبب لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا ہونے کی دعوت دی۔ خالد محمود عباسی صاحب نے مختصر اور جامع انداز میں تحریک کی دعوت پیش کی۔ ۲۰ افراد نے انتہائی توجہ اور دلچسپی سے گفتگو سنی۔ بعد ازاں محمد شمیم صاحب نے حاضرین کو اس کام میں تعاون کی اپیل کی۔ جس کے نتیجہ میں فوری طور پر ۱۶ افراد نے تحریک کی معاونت اختیار کی۔ یوں پٹن میں معاونین تحریک کی تعداد ستائیس (۲۷) ہو گئی۔ امید ہے کہ ڈاکٹر فضل الحق کام کو لگن سے آگے بڑھائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ریٹائرمنٹ کے بعد' جو جلد ہونے والی ہے' ہمہ وقت دین کے لئے وقف ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اللہ اس کی تکمیل فرمائے!

تقریباً ۱۲ بجے پٹن سے روانگی ہوئی۔ دوران سفر جیجال اور دبیر کے بازاروں میں ہینڈ بل تقسیم کئے گئے۔ سہ پہر دو بجے بشام وارد ہوئے۔ کھانے اور نماز سے فراغت کے بعد شہر سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر توحید آباد کی مسجد ابوبکرؓ میں بغرض قیام پڑاؤ کیا۔ محترم شمیم صاحب گزشتہ سال اسی مسجد میں جناب محمد اقبال ایڈووکیٹ اور عنایت الرحمٰن صاحب سے متعارف ہوئے تھے۔

ابوبکرؓ مسجد توحید آباد میں نماز عصر ادا کرنے کے بعد محمد شمیم صاحب نے درس قرآن دیا۔ بعد ازاں عمومی دعوت اور ہینڈبل کی تقسیم کے لئے بشام بازار کے لئے روانگی ہوئی۔ بازار میں ہینڈبل تقسیم کرنے کے بعد مینگورہ روڈ پر واقع مسجد میں نماز مغرب ادا کی گئی اور بعد ازاں شمس الحق اعوان صاحب نے درس قرآن دیا۔ نماز عشاء مسجد ابوبکرؓ ہی میں ادا کی گئی۔

اگلے روز یعنی ۲۴ جون کی نماز فجر کے بعد محمد شمیم صاحب نے درس قرآن دیا۔ حاضرین کی تعداد پچیس تھی۔ ناشتے کے بعد عنایت الرحمٰن اور محمد اقبال صاحب ایڈووکیٹ سے شمس الحق صاحب اور محمد شمیم صاحب نے تفصیلی دعوتی گفتگو کی۔ الحمدللہ دونوں احباب نے تحریک کی معاونت اختیار کر لی۔ نیز خالد محمود عباسی اور محمد اسلم صاحب علی الصبح چھتر روانہ ہو گئے ہمیں بٹگرام کی طرف جانے والی مرکزی سڑک پر چاپنگ کا کہا گیا۔

ایک بجے بٹگرام پہنچے تو رفقاء تین گروپوں کی شکل میں الگ الگ مساجد میں نماز جمعہ اور ہینڈبل کی تقسیم کے لئے گئے۔ اس کام سے فراغت کے بعد کھانا کھایا گیا اور قیام کے لئے تبلیغی مرکز کی مسجد پہنچ گئے۔ مسجد میں محمد فیاض ایڈووکیٹ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے تفصیلی ملاقات کا وقت طے کیا گیا۔ اس طے شدہ وقت کے مطابق امیر قافلہ اور محترم اعوان صاحب نے تفصیلی ملاقات کی جو بہت مفید رہی۔ موصوف علاقے کے بہت بڑے زمیندار اور سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

۲۵ جون نماز فجر کے بعد شمس الحق صاحب نے رفقاء کو صحیح تلاوت اور تجوید کے ابتدائی قواعد کی مشق کرائی۔ ناشتے سے فراغت کے بعد شمس الحق صاحب اور محمد شمیم صاحب نے معاونین سے رابطہ کیا اور مین بازار میں کارنر میٹنگ بھی کی۔ اس موقع پر اکیس حضرات نے تحریک کی معاونت اختیار کی۔ الحمدللہ بٹگرام میں بھی خلافت کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ بٹگرام سے فراغت کے بعد شمس الحق صاحب اور امیر کارواں محمد شمیم صاحب چھترپلین کے لئے روانہ ہوئے اور کچھ فاصلے پر سے چاپنگ پارٹی کو ہمراہ لیتے ہوئے اپنی اگلی منزل کی طرف عازم سفر ہوئے۔ ساڑھے دس بجے چھتر آمد ہوئی۔ چھترپلین میں پہلے سے آئے ہوئے ساتھیوں میں سے جمشید خان تو دوبارہ شریک قافلہ ہو گئے جبکہ خالد محمود عباسی اور چوہدری محمد اسلم امیر قافلہ سے رخصت لے کر اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ ان حضرات کو چھترپلین میں خطاب جمعہ کا موقع تو نہ مل سکا۔ البتہ جمعہ کے دن نماز عصر کے بعد خالد عباسی صاحب نے مسجد میں درس قرآن دیا۔ اسی شام جمشید خان کے گھر عباسی صاحب نے چھ افراد سے ملاقات کی اور اگلے روز یعنی ۲۵ جون کو چھترپلین بازار میں خالد عباسی صاحب نے کارنر میٹنگ سے خطاب کیا۔

بٹگرام سے پہنچنے والے رفقاء نے نماز ظہر سے کچھ دیر قبل آرام کیا۔ نماز کے بعد دہشت خان کے والد محترم حاجی فرید صاحب نے نمازی حضرات کو دعا کے بعد خطاب سننے کی بھرپور اور پرزور دعوت دی۔ حاجی صاحب موصوف چھترپلین کی انجمن دکانداراں کے صدر ہیں اور علاقے کی معزز شخصیت ہونے کے باعث خاصے اثر و رسوخ کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاذ ہی کوئی نمازی اٹھ کر گیا ہو' سبھی نے انتہائی توجہ سے شمس الحق صاحب کا جامع و موثر خطاب سنا۔ حاضرین کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ تھی۔ دس افراد نے فوری طور پر معاونت اختیار کی۔ نماز عصر سے مغرب تک بارش کے باعث کوئی پروگرام نہ ہو سکا۔ البتہ مغرب کے بعد جمشید خان ایک مقامی ساتھی عبدالوہاب کو مسجد میں بلا لائے جو بسلسلہ روزگار کراچی میں مقیم ہیں۔ ان کے ساتھ شمس الحق صاحب اور شمیم صاحب تفصیلی گفتگو کرتے رہے۔

عشاء کی نماز کے بعد مقامی کیسٹ محمد ادریس کو

ان کے دس سالہ بیٹا ذیشان شمس الحق صاحب کے پاس لے کر آیا اور اپنے والد صاحب کا تعارف کرایا۔ قبل ازیں وہ اپنے والد کو تحریک کے مختصر پیغام سے متعارف کرا چکا تھا چونکہ اس نے نماز ظہر کے بعد خطاب سنا تھا۔ ادریس صاحب نے تحریک کا مزید تعارف حاصل کرنے کے بعد معاونت اختیار کرلی۔ نیز اس گفتگو کے نتیجے میں دو اور حضرات نے بھی معاونت اختیار کی۔

۲۶ جون کو فجر کے بعد تربیتی پروگرام طے تھا۔ اس پروگرام میں تصحیح تلاوت وغیرہ شامل تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اگلی منزل کو روانگی کے لئے سامان سمیٹا گیا۔ ادھر شمس الحق صاحب اور امیر قافلہ' معاون تحریک محمد ادریس کے میڈیکل سٹور پر گئے اور ان کی وساطت سے مقامی سکول کے ایک استاد سے مفصل دعوتی گفتگو کی' جس کے نتیجہ میں انہوں نے معاونت اختیار فرمائی۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ تعلیم القرآن کے دو اساتذہ سے ملاقات کی۔ علماء کرام نے تحریک کی دعوت کی تائید فرمائی۔ چھتر پلین میں آخری اور اہم کام مقامی خلافت کمیٹی کی تشکیل تھا جو الحمد للہ معاونین کے مشورے کے بعد طے ہوگیا۔

یہاں سے چلنے کے بعد معاونین تحریک سے ملاقات کی غرض سے ڈاڈر کی طرف روانگی ہوئی جو شنکیاری سے کچھ فاصلہ پہلے بائیں ہاتھ جانے والی ذیلی سڑک پر واقع ہے۔ لیکن اس قصبے کے تینوں معاونین معاملات دنیوی کے باعث گھروں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ نیز انہیں ہماری آمد کی پیشگی اطلاع بھی نہیں تھی۔ اسی قصبہ میں ایک معاون تحریک کو ملنے کی غرض ڈاڈر سے چند کلومیٹر آگے تک جانا ہوا تو سرراہ چند لوگوں نے گاڑی پر لگے بینر "جمہوریت نہیں خلافت" کو پڑھ کر گاڑی روکی اور خلافت سے دلی محبت کا اظہار کیا نیز محترم ڈاکٹر صاحب کے اخباری مضامین کے مطالعے کا بھی انہوں نے خصوصیت سے ذکر کیا۔ انہیں ہینڈ بل دیئے گئے۔ انہوں نے دیگر ہم خیال احباب سے مشورہ کرنے کے بعد رابطہ کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ ۴ بجے ڈاڈر سے شنکیاری روانہ ہوئے۔ نماز عصر کے بعد ہینڈ بل تقسیم کئے گئے۔ اس کے بعد مانسہرہ کے لئے عازم سفر ہوئے۔ نماز مغرب سے کچھ دیر پہلے مانسہرہ پہنچ گئے۔

مانسہرہ میں معاونین تحریک خانی زمان اور ملک اورنگ زیب صاحب سے رابطہ ہوا۔ رات کا قیام سنہری مسجد میں ہوا۔ اس مسجد کے خطیب اور ملحقہ مدرسہ کے مہتمم مولانا فیض الباری صاحب ضلع کوہستان سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی علاقائی نسبت سے جمشید خان صاحب نے ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے مسجد میں قیام کی اجازت دے دی نیز چائے بسکٹ سے تواضع بھی فرمائی اور اگلے روز نماز فجر کے بعد خطاب کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ نماز فجر کے بعد شمس الحق صاحب نے حاضرین کے سامنے تحریک کی دعوت رکھی۔ ساٹھ' ستر حضرات شریک مجلس تھے۔ سامعین میں سے حاجی گل صاحب نے فوری طور پر تحریک کی معاونت اختیار کی۔ موصوف قیام کراچی اور پشاور کے دوران معروف لیبر لیڈر رہے ہیں' نیز بھٹو دور کے آغاز میں کاغان میں کسان بورڈ کی بنیاد بھی انہوں نے ہی رکھی تھی۔ حاجی گل صاحب نے شمس الحق صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ کی دعوت کے لحاظ سے وادی کاغان انتہائی زرخیز علاقہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرا آبائی علاقہ ہونے کی بنا پر میری وہاں خاصی جان پہچان ہے' اگر آپ وہاں جانا چاہیں تو میں آپ کے ہمراہ چلنے کے لئے حاضر ہوں۔

ان کی اس رائے پر رفقاء میں باہمی مشورہ ہوا اور یہ طے پایا کہ ابھی ہمارے پاس تین دن باقی ہیں اس لئے علاقے میں دعوتی کام کرنا چاہئے۔ جمشید خان کو ایبٹ آباد سے ملحقہ قصبے قلندر آباد میں معاونین سے رابطہ اور توسیع دعوت کے لئے بھیج دیا گیا تاکہ کاغان سے واپسی پر وہاں تحریک کا نظم قائم کیا جاسکے۔

۲۷ جون صبح دس بجے حاجی گل صاحب کی معیت میں وادی کاغان کے لئے روانگی ہوئی۔

راقم ان حسین وادیوں کی حسین یادوں میں مستغرق تھا کہ کبھی یہاں سید احمد شہید بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی قیادت میں اللہ کے دین کی اقامت کے لئے ایک قافلہ آیا تھا کہ ہمارے پہلے عارضی پڑاؤ کا مقام پٹہ بٹہ "آگیا" جہاں کے ہائی سکول میں گزشتہ سال شمس الحق صاحب سٹاف سے خطاب کرچکے تھے۔ اسی تعارف کی بنا پر مختصر گفتگو ہوئی۔ یہاں سے چل کر عطر شیشہ کے ہائی سکول میں کچھ دیر کے لئے رکنا ہوا۔ یہاں وقفہ کی مختصر چھٹی کے باعث معاون تحریک معروف صاحب کی وساطت سے سکول کے سٹاف سے خطاب کا موقع مل گیا۔ نماز ظہر جامع مسجد سید احمد شہیدؒ میں ادا کی گئی جو بالکل دریا کے کنارے واقع ہے۔ اس مسجد کا کچھ حصہ دریا میں ہے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد مسجد اہلحدیث میں نماز عصر ادا کی گئی۔ نماز کے بعد مغرب تک کے وقفہ میں انفرادی ملاقاتوں اور چاکنگ کا کام بھرپور انداز میں کیا گیا۔

بالاکوٹ پل پر دریا کا نظارہ کرنے کے لئے لوگ کثیر تعداد میں مختلف ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ وہاں پل کے اس پار شمیم صاحب نے چند افراد کے مجمع میں گفتگو شروع کی اور الحمد للہ ان حضرات میں سے ایک صاحب نے تعاون فارم پر کردیا۔ اسی طرح پل کی دوسری طرف شمس الحق اعوان صاحب نے آٹھ دس افراد کی ٹولی میں بات کا آغاز کیا۔ احمد پور شرقیہ سے آئے ہوئے دو حضرات ملک محمد اختر صاحب اور محمد اشرف صاحب نے کامل یکسوئی سے گفتگو سنی۔ دونوں حضرات انقلابی افکار سے ازحد متاثر ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کے انقلابی نظریات سے کسی درجہ شناسائی کا بھی اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم وڈیرہ شاہی کا اثر زائل کرنے کی نیت سے ہر دفعہ نوابان بہاولپور کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا کرتے ہیں۔ اس پر شمس الحق صاحب نے فرمایا کہ وڈیروں کے خلاف آپ کی جدوجہد قابل تحسین ہے لیکن ان سے چھٹکارا انقلابی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اعوان صاحب نے انقلابی طریق کار سے آگاہ کیا۔ دونوں حضرات نے انقلابی فکر سے کامل اتفاق کیا۔ انہوں نے اس کام کو بھرپور انداز میں پھیلانے کے عزم کا اظہار کیا۔ ملک اختر صاحب نے محترم ڈاکٹر صاحب کی کچھ بنیادی کتب کا تقاضا کیا جو کہ انہیں تحفتاً پیش کردی گئیں۔ ان حضرات نے خود رابطہ کرنے کا وعدہ کیا۔

اسی دوران نماز مغرب کا وقت ہوگیا تو تمام ساتھیوں نے مسجد اہلحدیث میں نماز ادا کی۔ بعد ازاں مسجد ہی میں قیام رہا۔ نماز عشاء کے بعد خطیب صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے نماز فجر کے بعد خطاب کرنے کی اجازت دے دی۔ صبح کا پروگرام یہ طے ہوا ہے کہ نماز اور درس کے فوراً بعد کاغان کے لئے روانگی ہوجائے گی۔

۲۸ جون نماز فجر کے بعد شمس الحق صاحب نے درس قرآن دیا۔ اس کے فوراً بعد کاغان کے لئے عازم سفر ہوگئے۔ پینتیس کلومیٹر کی مسافت کے بعد پارس کے مقام پر ناشتے کے لئے رکنا ہوا۔ اس کے بعد طوطاں کے شاپ پر حاجی گل صاحب کے واقف کار اختیار علی خان سے سرراہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے پرزور اصرار کرکے ہمیں اپنے گھر چائے پر بلالیا۔ موصوف دبئی میں بسلسلہ روزگار قیام پذیر ہیں آج کل چھٹی پر آئے ہوئے ہیں اور دبئی ابوظہبی میں محترم ڈاکٹر صاحب کے تقریباً تمام خطابات و دروس میں

شرکت کرتے ہیں۔ انہیں ڈاکٹر صاحب کے تحریکی کام سے بھی متعارف کرایا گیا۔ طوطاں کے بعد جرید میں مختصر قیام ہوا۔ یہاں سے چل کر ہم مہانڈری رکے۔ یہاں ہائی و پرائمری سکول کے اساتذہ میں ہینڈبل تقسیم کئے گئے۔ نیز تین اساتذہ سے شمیم صاحب کی انفرادی دعوتی ملاقات بھی ہوئی۔ شمس الحق صاحب اور امیر قافلہ ہائی سکول کاغان میں اساتذہ سے ملاقات کرنے گئے۔ تین اساتذہ سے حوصلہ افزا ملاقات ہوئی۔

ڈیڑھ بجے کاغان سے ناراں کے لئے روانگی ہوئی کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد حاجی گل صاحب کے آبائی گاؤں میں ایک ہوٹل پر کھانے کے لئے رکے یہاں ہوٹل پر دو حضرات سے دعوتی گفتگو ہوئی۔ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد ایک بار پھر عازم سفر ہوئے۔ تین مقامات پر خطرناک گلیشرز سے گزرتے ہوئے پانچ بجے ناراں پہنچے۔ اس سارے سفر کے دوران مختلف لوگوں سے ملاقات کے علاوہ ہینڈبل بھی تقسیم کئے گئے۔

ناراں پہنچنے کے بعد بازار کے شروع ہی میں واقع مسجد میں نماز عصر ادا کی گئی اور بعد ازاں ہینڈبل تقسیم کئے گئے۔ ایک بزرگ نے ہینڈبل لینے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ سب لوگ اسلام کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ محترم اعوان صاحب نے کہا کہ اب ہماری بات بھی آپ کو سننا پڑے گی۔ جب ان کے سامنے پوری بات رکھی گئی تو انہوں نے تحریک خلافت کی معاونت اختیار فرمائی۔ اس موقع پر تین دوسرے حضرات نے بھی معاونت اختیار فرمائی۔

نماز مغرب سے قبل ناران کے بازار میں ہینڈبل وسیع پیمانے پر تقسیم کئے گئے۔ نماز کے بعد مسجد میں شمس الحق صاحب نے خطاب فرمایا۔ رات کا قیام حاجی گل صاحب کے بھتیجے کی قیام گاہ میں ہوا۔ شام کے کھانے پر حاجی صاحب کے بھتیجے عبدالقدوس اور ان کے دوست محمد جاوید سے شمیم صاحب گفتگو کرتے رہے۔

۲۹ جون نماز فجر اور ناشتے کے بعد عبدالقدوس اور محمد جاوید معاون تحریک بن گئے نیز ملک محمد ادریس جو کہ یہاں ٹورسٹ گارڈ ہیں وہ بھی معاون تحریک بن گئے۔ ان سے ملاقات کی غرض سے نماز فجر کے بعد شمیم صاحب اور شمس الحق صاحب تشریف لے گئے تھے۔ بعد ازاں ملک ادریس صاحب کی وساطت سے دو مزید احباب معاون تحریک بن گئے۔ ملک محمد ادریس کے بھائی عبدالرشید صاحب پی۔ٹی۔ڈی۔سی موٹل میں کام کرتے ہیں۔ ان کی وساطت سے موٹل میں ایک مختصر سی کارنر میٹنگ ہوگئی جس سے شمیم صاحب نے خطاب کیا۔

ناران کے قیام کے دوران جاگیرداروں کے مظالم کی کئی داستانیں سننے کو ملیں۔ یہاں کے لوگوں میں جاگیرداروں کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ ان ستائے ہوئے لوگوں کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ ان کے دکھوں کا مداوا شمشیر فاروقیؓ سے ہوگا۔

ساڑھے دس بجے مقامی سکول میں گزشتہ روز بننے والے معاون سے شمس الحق صاحب اور شمیم صاحب نے ملاقات کی۔ جس کے فوراً بعد مانسہرہ کے لئے روانگی ہوگئی۔ مہانڈری میں کھانا اور نماز ظہر کے لئے رکے۔ ہوٹل میں ہینڈبل تقسیم کئے گئے۔ یہاں سے روانگی ہوئی تو جرید کے مقام پر سرراہ حاجی گل صاحب کے دوست غلام محمد صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ مختصر گفتگو کے بعد انہوں نے تحریک کی معاونت اختیار کرلی۔ جرید سے چل کر تقریباً مسلسل سفر جاری رہا اور مغرب کی نماز مانسہرہ کی داخلی مسجد میں ادا کی گئی۔ حاجی گل صاحب کے بھرپور دینی تعاون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں ان کے گھر چھوڑا گیا اور غازی کوٹ میں رفیق تنظیم ملک اورنگزیب کے گھر کے قریب واقع مسجد میں رات کے قیام کے لئے پڑاؤ کیا گیا۔ نماز عشاء کے بعد اہل محلہ میں سے دو افراد سے شمس الحق صاحب نے دعوتی گفتگو فرمائی۔

۳۰ جون نماز فجر کے بعد چھ نوجوان بچوں کا ایک گروپ نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد آیا تو بعد ازاں شمیم صاحب نے ان سے قرآن کی اہمیت و عظمت اور دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے موثر گفتگو کی۔ ناشتے کے فوراً بعد سامان تیار کرکے اورنگزیب صاحب کے ہمراہ مانسہرہ شہر روانگی ہوئی۔ دو دو رفقاء کے دو گروپوں نے مین بازاروں میں وسیع تعداد میں ہینڈبل تقسیم کئے۔ ارم ہوٹل میں ملازمت کرنے والے ایک ساتھی معاون تحریک بھی بنے۔ مانسہرہ سے فراغت کے بعد اورنگزیب صاحب کو غازی کوٹ چھوڑتے ہوئے ایبٹ آباد کی طرف روانہ ہوگئے۔ قلندر آباد کے بازار میں ہینڈبل تقسیم کئے گئے۔ قلندر آباد سے ملحق قصبے مانگل میں محترم جمشید خان صاحب ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے چند لمحوں میں ایک ہوٹل میں سولہ سترہ احباب کو بلالیا۔ یہاں شمس الحق صاحب نے مختصر مگر جامع خطاب کیا۔ ایک ساتھی معاون تحریک بننے پر آمادہ ہوئے۔ گزشتہ تین دنوں کے دوران جمشید خان نے مانگل اور قرب وجوار میں توسیع دعوت کا کام کیا۔ اس دعوت کے نتیجے میں پچاس حضرات نے تحریک کی معاونت اختیار کی۔ یہ مرد کوہستانی تحریک کے لئے یقیناً انتہائی قیمتی اثاثہ ہیں۔

بعد ازاں مانگل ہی کے دوسرے سٹاپ پر چند نئے معاونین سے جمشید خان نے ملاقات کرائی۔ شمیم صاحب نے تحریک کے اغراض و مقاصد اور دینی تقاضے بیان کئے۔ اس موقع پر ایک نئے معاون بھی بنے۔ مانگل میں بھی مقامی خلافت کمیٹی قائم کردی گئی۔ یہاں سے فارغ ہوکر جمشید خان کے ہمراہ قلندر آباد میں ایک معاون تحریک سے ملاقات ہوئی۔ انہیں لٹریچر دیا گیا نیز توسیع دعوت کے لئے ہدایات بھی دی گئیں۔ بعد ازاں مانگل پبلک سکول کے مالک عبدالوحید جدون صاحب سے ملاقات ہوئی جو گزشتہ روز ہی جمشید خان کی دعوت پر معاون تحریک بنے تھے۔ انہوں نے منظم انداز میں کام کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔

یہاں سے جمشید خان سے بمشکل رخصت کی اجازت حاصل ہوئی۔ انکا تو تقاضا تھا کہ ایک دو روز یہاں قیام کریں۔ اس لئے کہ یہاں کام کے بہت مواقع ہیں۔ لیکن طے شدہ پروگرام کے مطابق اب ہماری واپسی کا وقت آپہنچا تھا اس لئے جمشید خان اور عبدالوحید جدون کو خدا حافظ کہتے ہوئے مانگل سے ایبٹ آباد شہر کے لئے روانگی ہوئی۔ یہاں مین بازار میں معاون تحریک عبدالجلیل صاحب کی دکان پر ناظم حلقہ نے ان سے تفصیلی تبادلہ خیال کیا اور انہیں نچلی سطح تک تنظیم سازی کے لئے مشورے بھی دیئے۔ محترم ناظم حلقہ نے انہیں ضلعی خلافت کمیٹی کے ناظم کی ذمہ داریاں سنبھالنے پر آمادہ کیا۔ نیز دیگر عہدیداران کے تعین کرنے کا کام ان کے سپرد کیا۔

اس پورے سفر کے دوران ہم جہاں بھی گئے اور جب بھی ہمیں وقت ملا ہم نے ایک اہم کام چاکنگ کا کیا۔ پورے علاقہ کوہستان' کاغان' اور ناران کے درودیوار پر خلافت کا پیغام ثبت کردیا گیا۔ اس کام میں تقریباً تمام رفقاء نے ہی بہت محنت کی تاہم برادرم مقصود نے جس لگن محنت اور خوبصورتی سے چاکنگ کی یہ انہی کا حصہ ہے۔ اسی طرح ہم نے تقریباً پچیس ہزار ہینڈبل تقسیم کئے۔ اس دورہ کے بارے میں ساتھیوں کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ یوں تو جہاں بھی محنت

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

یہ تلخ نوائی آپ گوارا کریں گے؟

تحریر : نیئر زیدی

وہ "تاریک ایام" آج اپنے سنہری دور کے دن لگتے ہیں

زوال کے لغوی معنی ہم پر کیسے صادق آئیں گے!

ترجمہ : سردار اعوان

کیا یہ زوال پاکستان میں سیاسی تبدیلیوں کی ماں ثابت ہوگا؟ اگر میں ایک غیب دان یا علم نجوم کا ماہر ہوتا تو بہت آسان جواب تھا : ہاں! لیکن ایک سیاسی تجزیہ نگار ہونے کی حیثیت سے اس کی وضاحت بھی میرے ذمہ ہے' اور اگر یہ پیشینگوئی غلط ثابت ہوتی ہے تو مجھے خفت اٹھانے کے لئے بھی تیار رہنا ہوگا۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے دو باتوں کی وضاحت کردوں' اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ بعض قارئین کے لئے یہ اصطلاحات نئی ہوں۔ عراقی صدر صدام حسین نے خلیج کی جنگ کو جنگوں کی ماں قرار دیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ لفظ بڑے بڑے واقعات کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ لفظ "زوال" گریگوری کیلنڈر کی رو سے سال کے آخری تین ماہ یعنی اکتوبر' نومبر اور دسمبر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا لفظ "زوال" کو موجودہ حکومت کی معزولی کے معنوں میں لینا درست نہ ہوگا بلکہ اس سے مراد وہ وقت ہے جس میں موجودہ حکومت کی رخصتی عمل میں آئے گی۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا اپنا ایک انداز ہے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء کا دور سیاسی حکومتوں کے جوڑ توڑ کا عرصہ کہلاتا ہے جن کے نتیجے میں سیاسی عدم استحکام نے جنم لیا جو ملک کے معاشی اور سیاسی ڈھانچے کے لئے خطرناک ثابت ہوا۔ مگر اسے ستم ظریفی کہئے کہ آج کے دور کے مقابلے میں وہ تاریک ایام ایک سنہری دور کی مانند دکھائی پڑتے ہیں۔ جلا وطن صدر' سکندر مرزا لندن میں ان آسائشوں کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا جو خود ساختہ جلا وطن اپوزیشن لیڈر بینظیر بھٹو یا خود ساختہ بیمار' پیروں کے پیر الطاف حسین کو تا دم تحریر میسر ہیں۔ سکندر مرزا کا ان تمام سیاسی ریشہ دوانیوں اور آمرانہ ہتھکنڈوں کے باوصف' جو ان کے ساتھ منسوب ہیں' ایک عام فلیٹ میں قیام رہا اور پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتا رہا۔ سکندر مرزا کو "ییلو ٹیکسی سکیم" کی نہ سوجھی تھی نہ ہی اپنے خاندان والوں کو پلاٹ الاٹ کئے اسے صرف سیاسی "پلاٹوں" سے شغف رہا۔ آج ایک سابق ایم۔ این۔ اے بلکہ کسی ریٹائرڈ سرکاری ملازم کو بھی اس طرح کی پر مشقت زندگی سے سابقہ پیش نہیں آتا۔

بہرحال مذکورہ بالا سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کا حل ۱۹۵۸ء کے پہلے مارشل لاء کی شکل میں سامنے آیا۔ صدر جنرل (بعد میں فیلڈ مارشل) محمد ایوب خان سیاستدانوں کی ایک نئی نسل کو آگے لائے۔ انہوں نے گیارہ سال حکمرانی کی۔ ان کی بدنامی کا سبب یہ ہوا کہ ان کے بڑے بیٹے گوہر ایوب خان نے اپنے باپ کی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر ایک بینک سے قرض حاصل کیا اور ایک آٹو موبائیل پلانٹ لگا لیا (اور بعد میں ایک اور کمپنی قائم کرلی)۔ مگر اپنے کارکنوں کے بارے میں وہ بہت کشادہ دل تھا۔ نواز شریف ہونے کا ان کو کسی نے الزام نہیں دیا۔ (یہ اصطلاح اس وقت تک ناپید تھی)۔ ہاں! اپنے باپ کی انتخابات میں کامیابی کی خوشی مناتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لیاقت آباد ضرور گیا جہاں اس کے عملہ کی فائرنگ سے کچھ لوگ ہلاک ہوگئے۔ مگر اس جیالے پن کی باپ بیٹا دونوں کو سیاسی قیمت ادا کرنا پڑی۔

ایوب خان کو اس وقت زوال آیا جب اس نے عوام کو بتانا چاہا کہ معاشی طور پر جس قدر وہ خوشحال ہوچکے ہیں وہ لوگوں کی توقعات سے کہیں زیادہ ہے۔ ایوب خان نے امن و امان کی صورت حال کو خاصا محفوظ بنادیا تھا لہٰذا لوگوں نے بے دھڑک سڑکوں پر آکر انہیں جانے پر مجبور کردیا۔ بعد کے سیاستدانوں نے معلوم ہوتا ہے اس غلطی سے اچھا سبق حاصل کیا ہے لہٰذا کبھی بھی حالات کو پر امن نہیں رہنے دیا۔

گویا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۹ء تک بائیس سال عوام کو آزادی نصیب رہی۔ سول اور فوجی' ملی جلی حکمرانی کا عرصہ دونوں طرف یکساں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس میں یحییٰ خان کے مارشل لاء کے دو سال بھی جمع کرلیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور اس کی ذاتی زندگی کی رنگینیوں نے یحییٰ خان کے بہت سے اچھے کاموں کو بھی نگاہوں سے دور کردیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے کندھوں پر صرف آدھے پاکستان کا بوجھ آیا۔ جس سے سیاستدانوں کی تعداد میں از خود کمی واقع ہوگئی۔ چنانچہ اسے کسی مار دھاڑ کی ضرورت نہ تھی مگر پھر بھی وہ اس سے باز نہ آیا اور عوام کو اس حد تک مجبور کردیا کہ وہ ایئر مارشل اصغر خان تک کے پیچھے چل پڑے۔ لہٰذا کچھ عرصہ ملی جلی سول ملٹری سرکار جاری رہنے کے بعد پاکستان واپس مارشل لاء کی جانب مراجعت کرگیا اور چیف آف آرمی' سٹاف' جنرل محمد ضیاء الحق نے نوے دن کے اندر انتخابات کرانے کے وعدہ پر ۵ جون ۱۹۷۷ء کو اقتدار سنبھال لیا۔ مگر ۱۹۸۵ء تک حالات نے اسے وعدہ وفائی سے روکے رکھا۔

۱۹۸۵ء میں محمد خان جونیجو کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے سے لے کر آج تک کے عرصہ میں فوج نے انتخابات اور اقتدار کی منتقلی پر اثر انداز ہونے کے خاصے گر سیکھ لئے ہیں۔ نو سالوں میں آٹھ وزیر اعظم اور چار صدر (بشمول نگران صدر / وزراء اعظم) آ' جا چکے ہیں۔ کیا اس سے بہتری پیدا ہوئی؟ عوام کو جمہوریت اس لئے عزیز ہے کہ ان کے مسائل حل ہوں۔ خصوصاً خوراک' رہائش اور جان و مال کا تحفظ۔ اس کے بعد وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ملکی دفاع اور استحکام کے معاملات میں ان کی امنگوں اور خواہشات کا عکس موجود ہو اور آئندہ آنے والی نسلوں کو بہتر تعلیم اور معیار زندگی فراہم ہوسکے۔

آمریت کے تحت معدودے چند شخصیات اور خاندانوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ ایوب خان

کے دور میں ملک پر اکیس خاندان حکمران تھے' جن کی تعداد بڑھ کر اب کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔ لیکن ان اکیس خاندانوں نے اپنی دولت جائز کاروبار کے ذریعے بنائی تھی۔ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ قدرے کم منافع کما کر عام آدمی کے لئے بہتر سہولتیں مہیا کر سکتے تھے' مگر انہوں نے سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صارفین کی قوت خرید کے پیش نظر قیمتیں وصول کیں۔ یعنی قیمتوں اور اجرتوں کے درمیان ایک توازن موجود تھا جو کسی بھی معیشت کے لئے لازمی شے ہے۔ چونکہ ان خاندانوں کا تعلق کاروبار سے تھا اس لئے ان کے ہاں کھلی عیاشیاں اور بدمعاشیاں نہیں تھیں۔ یہ جو بھی حبیب' داؤد' اصفہانی' فینسی' بادانی وغیرہ تھے' ٹھیک ۹ بجے ان کے دفتر کھلتے اور مالک خود شام تک اپنے دفتروں میں موجود رہتے لہٰذا ان کے ملازم بھی کام کرتے۔ آج ان اکیس خاندانوں نے اپنا سرمایہ پاکستان سے باہر منتقل کر لیا ہے۔ پاکستان میں ان کی موجودگی بعض مخصوص شعبوں تک محدود ہے۔ اس لئے کہ پاکستان اب وہ مرغی نہیں رہی جو ہر روز سونے کا ایک انڈہ دیتی تھی۔ آج یہ مرغی جن کے قبضہ میں ہے وہ اسے مار کر ایک دفعہ سارے سونے کے انڈے نکال لینے کے چکر میں ہیں۔

اگر ۱۹۸۹ء سے اب تک کے بینظیر بھٹو اور نواز شریف کے اخباری بیانات کا جائزہ لیا جائے تو ان کا ان دونوں پر اس قدر یکسانیت کے ساتھ اطلاق ہوتا ہے کہ وقت کے آگے پیچھے ہونے کے سوا وہ خود بھی یہ فرق کرنے سے قاصر ہوں گے کہ یہ بات کس کے بارے میں ہے۔

ایک نئے آرمی چیف آف سٹاف کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ اسے اپنا کام سنبھالنے میں چھ ماہ کا عرصہ لگ جاتا ہے اور کسی سیاسی مہم جوئی کے قابل ہونے کے لئے اسے مزید ایک سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے لیکن جنرل عبدالوحید نے جتنے کم عرصہ میں اپنی اس صلاحیت کا مظاہرہ کیا وہ غیر معمولی طور پر سامنے آئی۔ سیاستدانوں کو چونکہ معلوم تھا کہ اندرونی اور بیرونی عوامل کے سبب فوج مارشل لاء نہیں لگا سکے گی لہٰذا انہوں نے اس کے مشوروں پر کان دھرنا ضروری نہ سمجھا۔ جنرل عبدالوحید نے نہ صرف آرمی چیف کے بارے میں جو تصور تھا اسے بدلا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کر کے بھی دکھاتے ہیں۔ انہوں نے جنوری ۱۹۹۳ء میں جنرل آصف نواز کی جگہ عہدہ سنبھالا۔ اپریل ۱۹۹۳ء تک صدر اسحاق خان قومی اسمبلی کو توڑ چکے تھے۔ سپریم کورٹ نے جب قومی اسمبلی اور نواز شریف حکومت دونوں کو بحال کر دیا تو اندازہ یہ تھا کہ اب کم از کم انہیں دوبارہ برخواست کرنے میں ایک سال کا عرصہ لگ جائے گا مگر جنرل عبدالوحید نے چند دنوں کے اندر صدر غلام اسحاق خان اور وزیر اعظم نواز شریف دونوں کو چلتا کر دیا۔ اکثر حضرات اس کی یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ جنرل عبدالوحید کو اپنے کور کمانڈروں کی پوری حمایت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی مرضی چلانے میں کامیاب ہو گئے' مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کور کمانڈروں کی حمایت حاصل کر لینے کا نام ہی تو قیادت ہے۔

میں کیوں اس قدر یقین سے کہہ رہا ہوں کہ مزید سیاسی تبدیلیاں عین متوقع ہیں؟ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ جنرل عبدالوحید جیسے لوگ کسی کام کو ادھورا چھوڑنا گوارا نہیں کر سکتے۔ صدر غلام اسحاق خان کے ساتھ ان کے خاندانی تعلقات ہی نہیں' وہ ان کے محسن بھی تھے۔ مگر اس کا جانا ضروری تھا اس لئے اسے جانا پڑا۔

آج ۱۹۹۳ء کے مقابلے میں حالات کسی طور بھی بہتر نہیں۔ یہ تو کہہ سکتے کہ مریض کو ۱۰۴ کی بجائے ۹۹ درجے کا بخار ہے۔ مگر بخار کا نہ ہونا اور مریض کے صحت یاب ہونے میں فرق ہے۔ بخار اتر جانے کے بعد بھی مریض کو توجہ درکار ہوتی ہے۔ پاکستان کا سیاسی نظام فرسودہ اور ناقص ہے۔ برطانوی طرز کا پارلیمانی نظام شروع سے حادثاتی ثابت ہوا ہے۔ فوج براہ راست

(باقی صفحہ ۷ پر)

فرمایا بھائی غفورے نے اور لکھا ان کے کراچی والے بھائی محمد سمیع نے

مایوسی کا شکار کون ہے؟

"اسلام پسندوں" کی صحافیانہ چابکدستیاں زیادہ ہی غضب ڈھاتی ہیں

میں نے "پروفیسر غفور صاحب" لکھنے سے اس لئے گریز کیا ہے کہ موصوف "ایک غیر عوامی" سیاسی جماعت کے ایک عوامی لیڈر ہیں جو اپنی جماعت کے حامیوں اور مخالفین میں یکساں مقبول ہیں۔ آج کل کے زمانے میں حامیوں اور مخالفین میں یکساں مقبولیت رکھنے کے لئے جن ہتھیاروں کی ضرورت ہے' موصوف ان سے بھی یقیناً لیس ہوں گے۔ بنا بریں انہیں کسی عوامی نام سے ہی پکارا جانا مناسب ہے۔ عوامی سیاستدانوں کی مجبوری ہوتی ہے کہ دوسروں کی طرف کچھ نہ کچھ پھینکتے ضرور ہیں' کسی کے لئے پھلجھڑیاں چھوڑیں' کسی پر سنگ ریزے برسائیں چاہے خود شیشے کے نگار خانے میں تشریف فرما ہوں۔ اوروں کی طرف گل پھینکنے والے اس خانہ برانداز چمن کی جھولی میں ڈاکٹر اسرار احمد کے لئے کوئی پھول نہیں بلکہ خار ہی خار ہیں۔ شاید بھائی غفورے کے لاشعور میں یہ خوف کہیں چھپا بیٹھا ہے "کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے"

بہرحال ان کے ارشادات نقل کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس رسالے کے رویئے کو بھی سامنے لے آیا جائے جو گاہے بگاہے حق مخالفت ادا کرتا رہتا ہے۔ کبھی نعیم صدیقی صاحب کے کالموں کے ذریعے تو کبھی "ڈاکٹر اسرار احمد کے ایم۔ کیو۔ ایم اور اس کے قائد کے بارے میں انکشافات" کے عنوان سے تو کبھی "پاسباں مل گئے کعبہ سے صنم خانہ کو" میں قلم کی چابکدستیوں کے ذریعے نام نہاد دینی صحافت کے اس علمبردار کی صحافیانہ دیانت کا عالم یہ ہے کہ اگر ان کے مضامین کے جواب میں مراسلہ بھیجا

جائے تو اس کی اشاعت سے گریز کیا جاتا ہے مبادا "پارسائی" کا بھانڈا بیچ چوراہے میں نہ پھوٹ جائے۔ اسی رسالے میں بھائی غفورے کے فرمودات بھی شائع ہوئے ہیں۔ ہمارے لئے تو معاملہ وہی ہے کہ ایک تو کریلا اوپر سے نیم چڑھا۔

بہرحال بھائی غفورے سے جب سوال کیا گیا کہ "ایک طرف ملک کی بقا کو خطرات لاحق ہیں جبکہ دوسری طرف اخبارات میں پاکستان کے جواز ہی کو باطل ٹھہرانے کا آغاز کردیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اسرار احمد کے مضامین بھی اخبارات میں آئے ہیں۔ آپ اس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔" تو انہوں نے فرمایا "کیا بات پوچھتے ہو ڈاکٹر اسرار احمد کی۔ وہ تو مایوسی کا شکار ہیں جو ان کا احساس شکست ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے عوام مایوس نہیں ہیں۔ وہ آج بھی اسلام کی بقا اور پاکستان کی سالمیت کے لئے سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں"۔

اب جو لوگ ڈاکٹر اسرار احمد کو مستقل سنتے ہیں وہ تو ان کے احساسات سے اچھی طرح واقف ہیں اور جن لوگوں نے "جنگ" میں ان کے مضامین پڑھے ہیں انہوں نے بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کے احساسات کا اچھی طرح اندازہ لگالیا ہوگا۔ انتہائی مایوس کن حالات میں بھی انہوں نے امیدوں کے چراغ جلائے ہوئے ہیں اور اس ملک کے مقصد وجود کے حصول کے لئے جس کے بغیر ان کو یقین ہے کہ پاکستان کا وجود باقی نہیں رہے گا' جو طریقہ کار انہوں نے اس ملک میں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے حصول کے لئے اختیار کیا ہے گو اس کو عوام میں قبول عام حاصل نہیں ہوا لیکن وہ پوری مستقل مزاجی کے ساتھ اسی کو لیکر چل رہے ہیں جو ان کے اپنے طریقہ کار پر یقین (جس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ سیرت النبی ﷺ سے ماخوذ ہے) اور مملکت خداداد سے ان کی پر خلوص وابستگی کا ثبوت ہے۔

بھائی غفورے کے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں استہزائیہ انداز سے قطع نظر کہ آخر وہ ٹھہرے عوامی لیڈر اور عوامی لیڈروں کے درمیان رہ کر ان کے طور طریقوں سے بچے رہنا ممکن نہیں' مایوسی والی بات خود ان کی اپنی جماعت پر منطبق نظر آتی ہے جس نے پہلے تحریک کی حیثیت سے اسلامی انقلاب کا نعرہ لگایا پھر منزل مراد کو بعجلت جا لینے کے شوق میں کشمکش اقتدار میں شریک ہوگئی لیکن جب اس سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا تو "قائد عوام" کے طرز پر عوامی مقبولیت کے حصول کے لئے "اسلامی فرنٹ" کی ڈگڈگی بجانی شروع کردی۔ مدیر تکبیر کی یہ خامہ فرسائی بھی کہ "پاسباں مل گئے کعبہ سے صنم خانے کو" ان ہی کی جماعت پر چسپاں ہوتی نظر آتی ہے کہ جماعت اسلامی نے پہلے ایم کیو ایم کی پیروی میں "پاسبان" تنظیم بنائی اور اس سے کچھ حاصل نہ ہوا تو پیپلز پارٹی کے طور طریقوں پر اسلامی فرنٹ کا قیام عمل میں آیا۔ ہاتھ کیا آیا صرف یہ کہ ع "اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی" اور کیوں نہ ہو کہ ع دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر۔

اب قارئین خود ہی اندازہ لگائیں کہ مایوسی کا شکار ڈاکٹر اسرار احمد ہیں جو آج بھی اسی طریقے پر گامزن ہیں جس کا آغاز انہوں نے تقریباً چالیس سال قبل کیا تھا یا جماعت اسلامی اور ان کے بھائی غفورے جو چل چل طور طریقے بدلتے رہے ہیں۔ بھائی غفورے عوام میں مقبولیت تو حاصل نہ کرسکے البتہ سیاستدانوں میں ضرور مقبول ہیں اس لئے کہ وہ صرف "بشیر" کا رول انجام دے رہے ہیں جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد "بشیر" کے ساتھ ساتھ "نذیر" کا کردار بھی ادا کرنے پر مصر

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

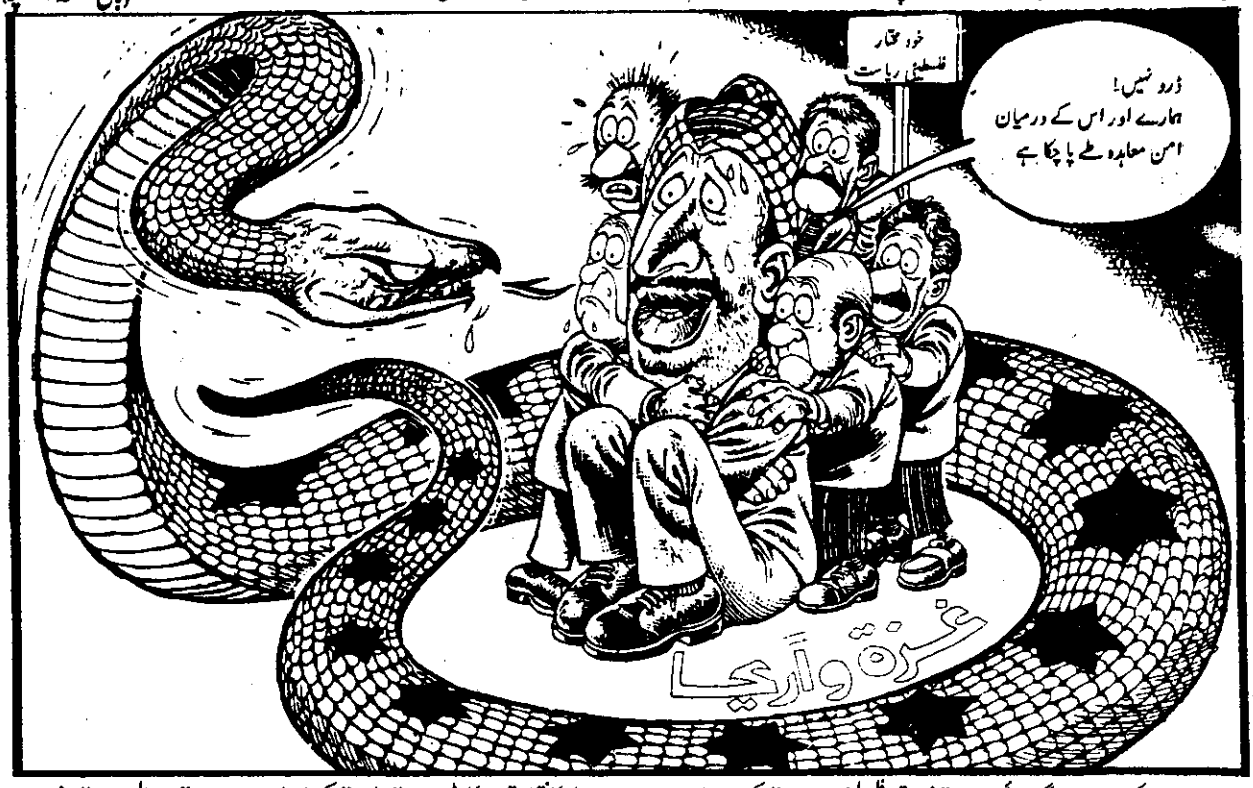

کیا اسیری ہے' کیا رہائی ہے!۔ "خود مختار فلسطینی ریاست" کے حدود اربعہ اور صورت حال کا نقشہ تو اس کارٹون میں "حماس" کے ترجمان پندرہ روزہ "بیت المقدس" نے اپنے شمارہ ۳۱/ جولائی میں ہمارے سامنے رکھ ہی دیا ہے۔ اب خیر سے ہاشمی مملکت' شرق اردن (اب اس ملک کا نام یہی ہونا چاہئے کیونکہ مغربی کنارے سے تو باقاعدہ ہاتھ دھولئے گئے ہیں) نے بھی اسرائیل سے معاہدۂ امن کرلیا ہے۔ یہاں "خالصہ" کیسے راج کرے گا' یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔

تحریک کے ناظمِ اعلیٰ شہرِ اقبال سیالکوٹ میں

وقائع نگار

ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان جنرل (ریٹائرڈ) ایم۔ایچ انصاری کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ نے اپنا شباب پاکستان کی نظریاتی و جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت میں گزارا اور اب آپ "والحفظون لحدود الله" کے مصداق اللہ کے دین کے قیام ونفاذ کے لئے کوشاں ہیں۔ داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار صاحب کے نعرہ قلندرانہ "من انصاری الی الله" پر لبیک کہتے ہوئے انتخابی ولدلی سیاست کو خیرباد کہا اور ہمہ تن خلافت کے احیاء اور قیام کے لئے اپنی تمامتر توانائیاں صرف کر رہے ہیں' یہ وہ تعارفی الفاظ تھے جو سٹیج سیکرٹری مرزا ندیم بیگ نے سیالکوٹ کے معززین شہر کے سامنے پیش کیے۔

۹/جولائی بروز ہفتہ سیالکوٹ شہر کے مقامی ہوٹل میں معززین شہر سے ایک ملاقات کا پروگرام رکھا گیا۔ اس پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ تلاوت، کلام پاک ناظم تحریک خلافت گوجرانوالہ ڈویژن جناب شاہد اسلم نے فرمائی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد جنرل صاحب نے اپنے پر تاثیر خطاب کا آغاز انتہائی درد مندی سے کیا۔ انہوں نے کہا کہ حضرات محترم! جان لیجئے کہ جس قدر اللہ نے ہمیں نعمتوں سے نوازا ہے مثلاً اللہ نے اگر تعلیم' مال اور اولاد وغیرہ ہمیں دیا ہے تو اسی قدر ذمہ داری میں اضافہ ہوا ہے۔ اور اسی قدر کڑا محاسبہ بھی ہم سے آخرت میں ہوگا۔ اسی ذمہ داری کی یاد دھانی کے لئے میں آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ وہ یاد دھانی یہ ہے کہ ہمارے اس ملک کے قیام کو نصف صدی ہوگئی ہے۔ اس ملک میں فوج' بیوروکریٹس اور سیاستدانوں نے حکومت کی لیکن کوئی بھی عزت سے رخصت نہیں ہوا۔ اس کی اصل وجہ وہ نظام ہے جو ہم نے اختیار کیا ہوا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ ہماری نفسیات سے متعلق نہیں ہے۔ کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا غلام ہے۔ اصل نظام وہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول اکرم ﷺ کو عطا کیا اور آپ نے اسے غالب کیا اور یہ نظام قائم ہوا ہے انقلابی جدوجہد کے ذریعے سے جو خود نبی اکرم ﷺ اور آپ کے جانثار صحابہ کرام نے کی۔

اگر ہم نے یہ نہ کیا تو جان لیجئے کہ گندم کے ساتھ جو بھی پس جاتا ہے۔ بدکار کے ساتھ نیکوکار بھی ہلاک ہوجاتا ہے۔ ہمیں اللہ کے انتقام سے باخبر رہنا چاہئے ورنہ سانحہ مشرقی پاکستان' جس کا میں چشم دید گواہ ہوں' کی طرح یہ باقی ملک نہ صرف تقسیم ہوسکتا ہے بلکہ ختم بھی ہوسکتا ہے۔ اس ملک کی بقاء اور استحکام اور ہماری اخروی نجات صرف اور صرف خلافت کے احیاء اور نفاذ میں ہے۔

خطاب کے بعد جنرل صاحب نے مہمانوں کے سوالات کے جواب دیئے پروگرام کے اختتام پر مہمانوں کے لئے پرتکلف عشائیہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ عشائیہ کے بعد نماز عشاء باجماعت ادا کی گئی۔ پروگرام کی کامیابی کے لئے سیالکوٹ کے جن ساتھیوں نے خوب محنت کی انکا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ملک تنویر الحق' کمانڈر طفیل صاحب' اسد اعجاز' جناب محمد رضوان' ذوالفقار شاہد اور ارشد مانڈا کی اَن تھک محنت سے یہ پروگرام کامیاب ہوا۔ اللہ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی محنتوں کو قبول کرے ○○

تحریکِ خلافت پاکستان
کے آغاز کا مقصد

☆ ☆ ☆

۱) نبی اکرم ﷺ کی واضح پیشینگوئیوں کے مطابق پورے کرۂ ارض پر نظامِ خلافت کے قیام کی راہ ہموار کرنا۔

۲) نظامِ خلافت کی برکات سے پاکستان اور تمام دنیا کے مسلم و غیر مسلم افراد کو متعارف کروانا۔

۳) رائج الوقت غیر فطری' ظالمانہ اور استحصالی نظاموں کی گمراہیوں اور خرابیوں سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔

۴) مسلمانانِ عالم میں دین کے تقاضوں کا شعور بیدار کرنا۔

۵) ابتدائی مرحلے کے طور پر پاکستان کے عوام کو ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا جہاں سے مذہبی فرقہ واریت اور انتخابی سیاست سے بالاتر ہوکر نظام خلافت کے قیام کے لئے منظم جدوجہد کی ضرورت کا احساس پیدا کیا جاسکے۔

اس طرح کی کسی خوش فہمی کا دماغ سے کبھی گزر تو ضرور ہوا ہو گا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ نہاں خانۂ قلب کے کسی گوشے میں یہ خیال تادمِ تحریر جاگزیں نہیں ہو سکا ہے کہ میرا شمار اہلِ قلم میں ہوتا ہے۔ میں مصنف' ادیب یا صحافی کبھی تھا نہ اب ہوں۔ بات بس اتنی سی ہے کہ ایک اجتماعیت سے منسلک ہونے کے بعد جن دنوں یہ احساس ڈسنے لگا تھا کہ جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اس کے لئے درکار قوت و توانائی جسم و جاں میں موجود نہیں' انہی دنوں حسنِ اتفاق سے ایک چھوٹی سی بات اس انکشاف کا بہانہ بن گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لکھنے کی کچھ صلاحیت ودیعت فرما رکھی ہے جسے استعمال کرنے میں جسمانی مشقت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چنانچہ قلم کو ذریعۂ اظہار بنانے کا سوچا اور کچھ تھوڑا بہت لکھنا شروع کر دیا۔ اس واقعہ پر بھی اب تک صرف آٹھ نو برسوں کا زمانہ گزرا ہے۔

پھر یہ انتخاب بھی کہ کون سے میدان میں اپنے قلم کا گھوڑا (یا ٹٹو) دوڑاؤں' کسی شعوری فیصلے کا نتیجہ نہیں تھا۔ تحت الشعور میں یہ حقیقت ایک امرِ واقعہ کے طور پر موجود تھی کہ حکمتِ قرآنی و اساساتِ دینی کی تنقیحات کے شعبے پر برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جو اس اجتماعیت کے قائد بھی ہیں' پوری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ حالات و واقعات کے ارتقاء اور ملکی و بین الاقوامی سیاست کے رجحانات کا تجزیہ بھی ہمارا یہ حلقہ انہی کا کیا سنتے اور اور انہی کا لکھا پڑھنے کا عادی تھا اور ہے اور سچ یہ ہے کہ وہ اپنے موضوعات کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ ہمارے اسلاف کی تصانیف کی شرحیں لکھ کر ہی ان کے لاتعداد خوشہ چیں صاحبانِ تصنیف بن گئے لیکن ڈاکٹر صاحب تقریر و تحریر میں موضوع کا کچھ ایسا "گھیراؤ" کرتے ہیں کہ کسی شارح کی بھی دال نہیں گل سکتی یعنی لکھنے کا یہ تنگنائے بھی مجھے میسر نہ تھا۔ اب میں اس سورج کی روشنی میں اپنا چراغ جلا کر نکلتا تو ظاہر ہے کہ تماشا ہی بنتا۔ بجھول چوک سے یہ حماقت کبھی سرزد ہو ہی گئی تو کسی نہ کسی قاری کی طرف سے ترت ڈانٹ موصول ہوئی کہ "ایاز' قدرِ خود بشناس" اپنے آپے میں رہو' زیادہ دانشوری نہ بگھارو۔

سوچا کہ ہلکی پھلکی تحریروں کی ہمارے جرائد میں بہت کمی ہے۔ علاوہ ازیں کہانی سے ہمیشہ سبق آموزی کا بڑا ہی موثر کام لیا گیا ہے لیکن افسانہ نویسی بھی اپنے بس کی بات نہ تھی کہ ایک مستقل فن ہے اور مہارت طلب کرتا ہے۔ اپنا حال یہ کہ Jack of all trades and master of none کی بدیسی لعاوت اس پر صادق آتی ہے جس کا اردو ترجمہ "ہرفن مولا" اس کے اصل مفہوم کو شاید ادا نہیں کرتا جو یہ ہے کہ آدمی ٹانگ تو ہر کام میں اڑائے لیکن کمال کا مظاہرہ کسی میں نہ کر سکے۔ ویسے مولا یا موئی کا لفظ لغات اضداد میں سے ہے۔ اس کے معنی آقا بھی ہیں اور غلام بھی اور یوں بات کچھ بن بھی جاتی ہے کہ کام تو آدمی سب کر لے لیکن ہوں سب "دو نمبر" کے۔ چنانچہ لے دے کے سفرنامے اور آپ بیتی کی ایک صنف نظر آئی جس میں رہوارِ قلم کچھ دور ساتھ دے سکتا تھا کیونکہ ایک بھرپور زندگی گزارنے اور

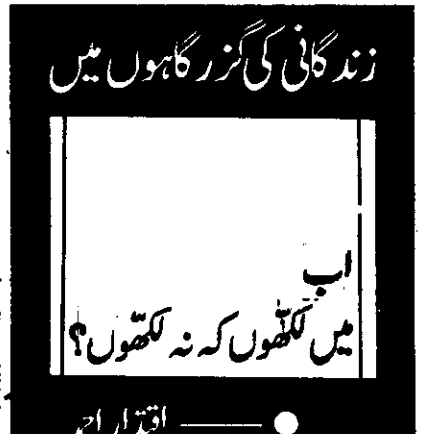

متعدد غیر ملکی سفر کرنے کے بعد مشاہدات و تاثرات کا ایک خاصا ہی بڑا ذخیرہ یادداشت کی تہوں میں مدفون تھا۔ آپ بیتی ادب کی ایک مستقل صنف اور آٹو بایوگرافی لٹریچر کا قابلِ قدر شعبہ ہے اور یہ بھی نہیں کہ کارزارِ حیات کے شہسواروں ہی کی لکھی ہوئی یہ چیزیں پڑھی جاتی ہوں' مجھ جیسے عامی بھی توجہ حاصل کر لیتے ہیں بشرطیکہ تحریر میں کچھ جان ہو اور وہ کوئی پیغام بھی دیتی محسوس ہو۔ امید تھی کہ میری آپ بیتی اسی مقصد کی کچھ خدمت انجام دے گی جسے شعوری طور پر زندگی کا عنوان بنایا ہے۔ سو "زندگانی کی گزرگاہوں میں" اور کچھ سفرناموں میں گڑے مردے اکھاڑنے شروع کر دیئے اور اس کوشش کو کسی درجے میں قبولِ عام کی سند بھی ملی۔

قبولِ عام کی یہ سند بھی کچھ بہت مصدقہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ بس اتنا ہوا تھا کہ ادیبوں کی بعض نجی محفلوں میں میرے سفرناموں کا تذکرہ ہوا' چند ایک مشاہیرِ ادب نے حوصلہ افزائی کے لئے مجھ سے ذاتی رابطہ کر کے تحسین فرمائی۔ قرار دیا گیا کہ میرے سفرناموں کا ایک الگ انداز ہے' مشاہدات ایک منفرد زاویۂ نگاہ کی غمازی کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری رودادوں میں سیدھی سادھی سچائی جھلکتی ہے جبکہ اکثر معروف ادیبوں کے شاہکار سفرناموں میں جھوٹ کے مصالحہ کی آمیزش پچاس فیصد سے کم نہیں ہوتی۔ متعدد مہربانوں نے باصرار کہا کہ اپنے سفرناموں کی قسطیں جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کرو تو یہ اس مقبول صنفِ ادب میں ایک اچھا اضافہ ہو گا' وغیرہ۔ "زندگانی کی گزرگاہوں میں" لکھنا شروع کیا تو پاکستان میں اردو ادب کے دو قلم قبیلوں میں سے ایک کے مسلمہ و فاضل سرخیل نے اپنے خلیفۂ مجاز سے کہا (اور خود انہوں نے مجھ سے اسے روایت کیا تھا) کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص (یعنی خاکسار) نے میری فلاں کتاب پڑھی ہے اور اسی کی طرز مستعار لی ہے۔ جبکہ میرا بیان حلفی یہ ہے کہ میں نے تو قبل ازاں اس کتاب کا نام بھی نہ سنا تھا' بعد میں بھی اسے نہ پڑھا اور اسی پہ کیا موقوف' یوں کہوں تو ہرگز مبالغہ نہ ہو گا کہ میں نے ادبی کتابیں سرے سے پڑھی ہی نہیں بلکہ سفرنامے بھی نہیں دیکھے۔ میری فعال زندگی جن بکھیڑوں میں گزری' وہ ادب سے زیادہ بے ادبی سے عبارت تھے اور عملی زندگی میں داخلے کے بعد اس فرصت کو کبھی خواب تک میں نہ پایا کہ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے۔

دوسری طرف وہ حلقۂ قارئین جس کے لئے لکھتا تھا' الاماشاء اللہ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھا رہا اور اس اجتماعیت کے اکابرین سے جسے میں نے دل ہار دیا تھا' کبھی بھولے سے بھی یہ گناہِ کبیرہ سرزد نہ ہوا کہ میری کسی تحریر کے حق میں کوئی کلمۂ خیر صادر ہو جاتا۔ اور انگریزی محاورے کے مطابق اونٹ کی کمر توڑ کر رکھ دینے والا آخری تنکا یہ ثابت ہوا کہ جب تھک ہار کر اپنے پرچے کو میں نے اپنی اسی اجتماعیت کو پیش کر دیا کہ سپردم بہ تو مایہ خویش را' تو اعلیٰ ترین پالیسی ساز ادارے میں اس کی آئندہ صورت و سیرت پر گفتگو میں مجھ سے کہا گیا کہ یہ ادبی صفحے اور سفرنامے وغیرہ فالتو چیزیں ہیں' پرچے سے نکال دی جائیں اور دو درجن کے قریب میرے حاضر و موجود محترم اکابرین میں سے کسی کی طرف سے یہ "پوائنٹ آف آرڈر" نہ اٹھایا گیا کہ ان میں کبھی کبھار تو کوئی کام کی بات بھی آ ہی

جاتی ہے۔ اس حادثے نے مجھ پر جو اثرات چھوڑے ان کا اندازہ اہلِ دل ہی کر سکتے ہیں۔ میں اسے سہ تو گیا کہ اور چارۂ کار بھی کیا تھا لیکن قلم کو گرہ لگ گئی اور پھر ایک عرصہ تک میں یہ "فضول چیزیں" لکھ ہی نہ سکا۔ یہ تمغۂ حسنِ کارکردگی میرے سینے پر آویزاں نہیں، دل پہ چسپاں رہا۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ بایں ہمہ ناشکری ہو گی اگر گنتی کے ان رفقاء کا احسان فراموش کردوں جو کبھی ملتے تو میری تحریروں کی تعریف کر دیتے تھے لیکن شاید یہ بھی میرے اپنے دل کا چور ہی تھا جو اسے منہ دیکھے کی محبت قرار دیتا رہا کیونکہ ان میں سے بھی سوائے ایک محترم و بزرگ رفیق کے کسی کو کبھی مجھے دو حرفی خط لکھنے کی توفیق نہ ہوئی تھی اور یاد نہیں کہ کبھی کوئی ساتھی خاص ایسی کوئی بات کہنے کی غرض سے ہی مجھ سے آکر ملا ہو۔

بہت دنوں لکھنے کا سلسلہ موقوف رہا۔ پھر ایک سفر برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے ساتھ ترکی کا کیا تو ایک نئے تجربے کی سوجھی۔ واپس آکر سوچا کہ تازہ تازہ لکھ کر دیکھا جائے کیونکہ پہلے جتنے سفرنامے لکھے وہ برسا برس کے بعد محض یادداشت کے بل پر سپردِ قلم کیے تھے۔ اب آپ سے کیا پردہ، میرا حافظہ اتنا اچھا تو نہیں لیکن عجیب ماجرا ہوا کہ جب کسی سفر کی روداد لکھنے بیٹھتا تو اس کے واقعات بلکہ لوگوں سے ملاقاتوں تک کی ایک فلم سی ذہن کے پردۂ سکرین پر چلنے لگتی۔ چودہ پندرہ سال پہلے انگلستان کے ایک سفر میں لندن سے سو سوا سو میل جنوب مشرق میں واقع قصبہ نورچ اور اس کے مضافات میں جانے اور ایک دلچسپ شخص میجر گرنی کی مزیدار باتیں سننے کا اتفاق ہوا تھا جو انڈین آرمی سے ریٹائر ہوئے اور موجودہ پاکستان کے شہروں اور دیہات سے پرانی یاداللہ رکھتے تھے۔ ان کے فارم ہاؤس پر جو تبادلۂ خیال ہوا اور ہمارے انجان برطانوی میزبان نے ریلوے سٹیشن سے اپنے ادارے تک کے سفر میں کار چلاتے ہوئے اپنی دیہی سڑکوں کے بارے میں جو دلچسپ معذرت خواہانہ جملے کہے (ان کا خیال شاید یہ تھا کہ پاکستان کی "رابطہ سڑکیں" جرمنی اور فرانس کے معیار کی ہوں گی)، وہ سب گفتگوئیں میں نے بے کم و کاست لکھ ڈالیں۔ اس سفر میں میرے مرحوم بھانجے اور داماد عبداللہ طاہر مرحوم اور بڑے صاحبزادے اسعد سلمہ بھی ساتھ تھے۔ طاہر تو اب گواہی کے لئے موجود نہیں، اسعد میاں سفرنامے کی وہ قسط پڑھ کر حیران رہ گئے۔ پورا نقشہ ان کے ذہن میں بھی تازہ ہو گیا اور انہوں نے تصدیق کی کہ آپ نے میزبان اور میجر گرنی کے چہرے کے تاثرات تک کی وہ تصویر کشی کر دی ہے جو کم از کم میرے ذہن سے بالکل محو ہو چکی تھی۔

ترکی کے سفرنامے کی "زبان یار من ترکی....." کے زیرِ عنوان چند ہی قسطیں شائع ہوئی تھیں کہ علالت نے مجھے صاحبِ فراش کر دیا اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا حالانکہ اس کا دلچسپ ترین حصہ ابھی باقی ہے اور جی چاہتا ہے کہ لکھ ہی ڈالوں۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، لیکن ضروری تو نہیں کہ یہ ارمان بھی نکل پائے گا جو زندگی کی مہلت اور صحت کی سلامتی کے ساتھ مشروط بھی ہے۔ اس کے علاوہ چین و جاپان اور بالخصوص امریکہ کی سیر میں بھی لوگوں کو شریک کرنے کی آرزو ہے۔ پھر "زندگانی کی گزرگاہوں میں" کے تحت اپنی آپ بیتیاں اللہ کے فرستادہ کراماً کاتبین کے رجسٹر میں تو علاوہ دیگر رطب و یابس کے لکھی لکھائی پڑی ہیں، خود لکھتا رہوں تو یہ سلسلہ بھی بندگانِ خدا کو مفید محسوس ہو گا لیکن گرہ قلم کی ذرا کھلی ہی تھی کہ میری شامتِ اعمال نے ایک بار پھر مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

ملکی سطح پر ہماری ہیئتِ اجتماعی کے اعلیٰ ترین احتسابی ادارے کے گزشتہ اجلاس میں ایک فاضل عضو نے اپنے علاقے کے ایک صاحبِ فہم و ذکا ساتھی کے میرے سلسلۂ مضامین پر دو اعتراضات پیش فرمائے۔ (عضو مروجہ عربی میں کسی مجلس یا کمیٹی کے رکن کو کہتے ہیں، اس ادارے کا ایک عضو میں بھی ہوں لیکن عربی کا نہیں بلکہ اردو فارسی کا عضوئے معطل اور عضوئے ضعیف بھی!) پہلا یہ کہ اس میں لکھنے والے نے اپنی ذاتی تشہیر (Self-projection) بہت کی ہے اور دوسرے یہ کہ لکھنے والا عنوان کے ساتھ اپنی تصویر کیوں ٹانکتا ہے!۔

بات کرنی مجھے مشکل بھی ایسی تو نہ تھی، لیکن چونکہ وہ محفل اور خود معاملے کی نوعیت بھی کچھ ایسی تھی لہٰذا مکمل کر وضاحت نہ کر سکا ——————

—————— اب کہے بنا رہا نہیں جاتا۔ پہلی بات یہ کہ سچی باتیں تو صرف آپ بیتی میں ہی کہی جا سکتی ہیں۔ لکھنے والا اگر دیانتداری سے کام لے تو اپنے محسوسات اور تاثرات ہی ٹھیک ٹھیک بیان کر پاتا ہے، اپنے قلب کی واردات کو ہی حاشیہ آرائی کے بغیر لکھ سکتا ہے ورنہ جگ بیتی میں تو دوسروں کی طرف اپنی باتیں جھوٹ موٹ منسوب کرنی پڑتی ہیں اور سارا زور عبارت آرائی پر صرف ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ بیتی میں سے "آپ" خود ہی نکل جائیں تو باقی کیا بچے گا؟۔ بیتی، یعنی چہ!۔ یہ "آپ" محض خود نمائی ہے تو اسے واقعی گندے انڈے کی طرح اٹھا کر باہر گلی میں (کوئی بھلا آدمی دیکھ کر) پھینک دیا جانا چاہئے ورنہ اسی بات سے مطلب رکھئے کہ پڑھنے والوں کی معلومات میں کوئی اضافہ ہوا؟۔ کوئی بھلی بات بھلی اور بُری بات بُری لگی؟۔ ان قدروں کی عظمت کا نقش دلوں پر گہرا ہوا جو ہمیں عزیز ہیں؟۔ اور کسی ذاتی تجربے میں قاری نے خود کو بھی شریک محسوس کیا؟۔ اگر نہیں تو ایں دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ۔ مجھے آزادیٔ تحریر سے محروم کر دیجئے، آزادیٔ تقریر سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت مجھ میں موجود ہی نہیں چنانچہ کھیل ختم اور وہ پیسہ ہضم جو میں نے گھومنے پھرنے پر اور زندگی کے نادر لیکن مہنگے تجربات حاصل کرنے پر خرچ کیا ہے۔

رہی تصویر کی بات تو اس کی حلت و حرمت پر گفتگو کا میں مجاز ہی نہیں۔ البتہ یہ جانتا ہوں کہ ہاتھ سے بنی تصویر اور مجسمہ تو باتفاقِ رائے حرام ہے، پاکستان میں ایسے علمائے دین بھی موجود ہیں (اگرچہ بہت شاذ) جو فوٹو کو بھی اس درجہ حرام سمجھتے ہیں کہ شناختی کارڈ نہ بنوا کر اپنی شہریت تک کو معرضِ خطر میں ڈالے بیٹھے ہیں اور فرضیتِ حج کو بھی اس بنا پر ساقط قرار دیتے ہیں کہ فوٹو کے بغیر اس مبارک سفر کے لئے درکار ضروری دستاویزات تیار نہیں ہو سکتیں۔ دوسری طرف پورے عالمِ عرب میں نظری طور پر بھی اور پاکستان میں گومگو کی کیفیت کے باوجود بھرپور عملی انداز میں فوٹو، فلم اور ویڈیو کو تصویر نہیں بلکہ عکس قرار دیا جاتا ہے، ویسا ہی ایک عکس جو اپنے سراپا کا آپ کو آئینے میں نظر آتا ہے اور بالکل جائز ہے۔ میں اسی دوسرے نقطۂ نظر کا حامل اور اسی پر عامل بھی ہوں اگرچہ میرے پورے گھر میں آپ کو انسان کی کجا، کسی جاندار کی تصویر بھی آویزاں یا کسی فریم میں لگی نظر نہ آئے گی۔ بدقسمتی سے عالمِ اسلام میں کوئی ایسا مرکزی ادارہ موجود نہیں جو اجتہاد سے کام لے کر اس مسئلہ کا ٹنٹا ایک ہی دفعہ نمٹا دے چنانچہ ہر کوئی اپنا "صوابدیدی" اختیار استعمال کرنے میں آزاد ہے۔ میں نے رسمِ دنیا کی تقلید میں اپنی ایک تصویر عنوان

کے چوکھٹے میں فٹ کرنی شروع کر دی تھی جس کا یہ استعمال اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین کا تقریباً لازمی حصہ بن چکا ہے۔ وجہ شاید یہ ہو کہ اب قاری کوئی تحریر پڑھتے ہوئے مضمون نگار کی شکل پر بھی نگاہِ غلط انداز ڈالنا چاہتا ہے کہ یہ منہ اور مسور کی دال!۔ فیصلہ بہرحال یہ ہوا کہ واقعاتی تصاویر تو "ندائے خلافت" میں آتی رہیں گی، محض نمائشی نہیں۔ گویا جب کبھی کسی جگہ دستی بم پھینکتے مجھے کیمرے کی آنکھ رنگے ہاتھوں پکڑ لے گی تب میری تصویر بھی چھپ جائے گی جس کی ہمت اپنے اندر نہیں چنانچہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

اور اے قارئین کرام، اب جگر تھام کر بیٹھئے اور میرا بیان صفائی بھی سنتے جائیے۔ ایک پہلو سے اپنا جائزہ لوں تو حرف کی حرمت کا لالچ بلاشبہ رکھا، لکھنے لکھانے سے کبھی ایک موری والا پیسہ بھی (اب ٹیڈی پیسہ کہہ لیجئے) میں نے نہیں کمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روزی کی اس نوع کا مجھے اب تک تو محتاج نہیں کیا، آگے کی خبر خدا جانے۔ یہ ایڈیٹری بھی پہلے دن سے آج تک اعزازی ہے، بایں معنی کہ پلے سے کچھ خرچ ہی ہوا، وصول کچھ نہ کیا۔ ہاں دوسرے پہلو پر غور کروں تو ماننا پڑتا ہے کہ میں فرشتہ بھی نہیں ہوں کہ انانیت سے بالکلیہ پاک ہونے کا دعویٰ کروں۔ آخر اس ربِ ذوالجلال کا بندہ ہوں جس پر بالفاظِ قرآنی "لا الٰہ الا انا" کی شاہانہ قبا سج دھج دکھاتی ہے لیکن میری "انا" بامرِ مجبوری سکڑ کر "انائے صُغیّر" ہو گئی ہے (صُغیّر عربی میں صغیر کی تصغیر ہے یعنی بالکل چھوٹی، ننھی منی سی!) اور بامرِ مجبوری کی ترکیب میں نے جان بوجھ کر اس لئے استعمال کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ تامہ سے میری "انا" کو متورم ہونے کا موقع ہی نہیں دیا یعنی بحمد اللہ اس آزمائش میں مبتلا نہیں کیا گیا ہوں۔ قلم ہاتھ میں لیا تو یہ میری زندگی کا وہ دور تھا جس میں کمر پر گناہوں کا بوجھ لادے کشاں کشاں لڑکھڑاتے قدم اپنی قبر کی طرف بڑھا رہا ہوں چنانچہ سانس ہر وقت پھولا رہتا ہے۔ گناہوں کی اس پوٹ میں شوق خود نمائی جیسا حجم رکھنے والی کسی چیز کو ٹھونسنے کی گنجائش ہی نہیں اور اس کا وزن بھی مزید بڑھ جاتا ہے جس کے بعد سانس کی ڈوری کا کچا دھاگا کل کا ٹوٹتا آج ٹوٹ جائے گا۔ اتنا بے دم رہتا ہوں کہ مجلسی گفتگو کے بھی قابل نہیں رہا، ذرا دیر بول کر ہانپنے لگتا ہوں چنانچہ طبیعت میں مردم بیزاری در آئی ہے۔ تقاریب او محفلوں سے کنی کتراتا اور جان چھڑاتا ہوں، ملنے ملانے سے گھبراتا ہوں جس کے بغیر اس زمانے میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ یہاں چلت پھرت دکھانے والے اچھے بھلے چرب زبان طرم خاں بھی یہ گلہ کرتے سنائی دیتے ہیں کہ کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی۔ ایسے میں نام و نمود کی خواہش سے مجھے کیا حاصل ہوگا چنانچہ سر میں خود نمائی کا سودا سمائے تو مجھے چار نمبر بس کا ٹکٹ لے لینا چاہئے۔ (اس روٹ پر جیل روڈ کا پاگل خانہ واقع تھا۔ وہ ہسپتال نما جیل تو اب بہت کچھ سکڑ گئی ہے، بس نہ جانے کس نمبر کی ادھر جاتی ہے)۔ میری انائے صُغیّر نے اپنی تسکین کے لئے کوئی اور قرینہ ایجاد کر لیا ہو تو یہ بعید از قیاس بھی نہیں تاہم ناموری کا چسکا میری رسائی سے باہر ہو چکا ہے۔ (شاید حالی کا مصرع ہے "نہیں پارسائی، یہ ہے نارسائی")۔ چنانچہ اس حوالے سے مجھ پر کسی شک و شبہ کا اظہار بے بنیاد الزام ہے، اتہام ہے۔

تصویر کا معاملہ بھی تفصیل طلب ہے اور غیر دلچسپ نہیں۔ میری جو فوٹو "زندگانی کی گزر گاہوں میں" کے عنوان کے ساتھ چسپاں تھی، وہ ضرورتِ رشتہ کے کسی اشتہار کا کام تو دے ہی نہیں سکتی، اس کا "پازیٹو" بہت دن ادھر ادھر پڑا رلتا رہا اور اس پر اتنی Scratches پڑ چکی تھیں کہ وہ تصویر کم اور کارٹون زیادہ لگنے لگا تھا۔ پھر اللہ میاں نے صورت تو مجھے اگرچہ میری اوقات سے بڑھ کر اچھی دی ہے لیکن بہرحال یہ خام خیالی کبھی لاحق نہیں ہوئی کہ وجیہ مردوں میں شمار ہوتا ہوں۔ یہ جو خوبصورت لوگوں کو ایک مصیبت کا سامنا رہتا ہے کہ۔

اچھی صورت بھی کیا بُری شے ہے
جس نے ڈالی بُری نظر ڈالی

اس مشکل سے مجھے اللہ نے بچائے رکھا ورنہ خبر نہیں کس فتنے کا شکار ہو جاتا۔ بہرحال اب اس "حرام شے" کو میں نے گھر میں اپنی الماری کے ایک ایسے گوشے میں پھینک دیا ہے کہ بعد مرنے کے مرے گھر سے نکلنے والے سامان کے ساتھ ہی برامد ہوگی۔ یہ راز بھی کھول ہی دوں کہ مجھے اپنی وہ تصویر اس لئے پسند تھی کہ میرا چوکھٹا Photogenic بالکل نہیں ہے اور وہ حسن اتفاق سے اچھی بن گئی تھی۔ تقریب اس کے بننے کی یہ ہوئی کہ امریکی قونصلیٹ میں ویزہ لینے گیا تو پاسپورٹ پر لگی ہوئی میری تصویر کاؤنٹر پر براجمان بی بی کو پسند نہ آئی، کہا کہ نئی تصویر کھنچوا کر لاؤ کیونکہ تمہارا فوٹو ہمارے مطلوبہ فنی معیار پر پورا نہیں اترتا اور وہیں موجود ویزے کے امیدواروں نے بتایا کہ گلبرگ کے فلاں فوٹوگرافر کے پاس جاؤ، اس کی تصویر قابل قبول ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی فوٹوگرافر سے کھڑے کھڑے تصویر اتروائی جسے شرفِ قبولیت عطا کر کے پاسپورٹ کے اسی صفحے کی پشت پر چسپاں اور مہر سے سرفراز کر دیا گیا جس پر ویزا لگا تھا اور ایک پرنٹ بچ بھی رہا۔

آپ پوچھیں گے کہ میں نے دل کے یہ پھپھولے سب کے سامنے کیوں پھوڑے؟۔ تو سچی بات یہ ہے کہ خودکشی حرام موت نہ ہوتی تو اپنا سینہ چاک کر کے اس دل کے داغوں کی بہار آپ کو دکھاتا جو، دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا۔ میں کیا، میری اوقات کیا، یہ زمین پتہ نہیں کیسے کیسے آسمان کھا گئی ہے اور یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔ مجھ میں کوئی خوبی ہوتی تب بھی بہت سے بہت یہی تو کہہ سکتا تھا کہ۔

یوں ہی آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے، کوئی ہم سا ہوگا

آپ سے توقع خستگی کی داد پانے کی ہے، جو دے اس کا بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ ہاں ایک متعین غرض بھی ہے، یہ کہ آپ نے اگر میری کچھ تحریریں پڑھی ہیں تو ایک احسان یہ کیجئے کہ ڈاک کے لفافے کا ایک روپیہ سکہ رائج الوقت خرچ کر کے مجھے اس سوال کا جواب لکھ بھیجئے یعنی میرے ساتھ یہ نیکی کر کے اسے ڈاک خانے کے دریا میں ڈال بھی دیجئے کہ "اب میں لکھوں کہ نہ لکھوں؟"

پشاور ٹی وی نے ایک کردار تخلیق کیا تھا جو ایک مخصوص وضع قطع میں حاضرین و سامعین کی محفل کے سامنے پیش ہو کر بڑے دلچسپ پیرائے میں ایک طنزیہ "سی حرفی" سناتا اور پھر پوچھتا "اب میں بولوں کہ نہ بولوں" اور لوگ بیک آواز جواب دیتے "بولو، بولو" جس پر وہ ایک اور شگوفہ چھوڑتا اور یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا کرتا تھا۔ بہت دنوں سے ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا ہے، معلوم نہیں ویسا کوئی پروگرام اب بھی آتا ہے کہ نہیں۔ سو "ندائے خلافت" کے کرم فرما قارئین کی غالب اکثریت مجھے یہ لکھے کہ "لکھو، لکھو" تو سر آنکھوں پر، مشقِ سخن جاری رکھنے کی کوشش کروں گا اور اگر حکم دیں کہ "بہت ہو چکا، بس کرو" تب بھی (باقی صفحہ ۲۶ پر)

بقیہ : اداریہ

باوصف مختلف مواقع پر ایسی باتیں بھی کہہ گئے جو اب ان کے اصل موقف کے خلاف استعمال ہوتی ہیں۔

گویا ہم قائد اعظم کو کوئی الزام نہیں دیتے بلکہ ان کی فروگزاشتوں پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتے اور مسلمانوں کے لئے ان کے ایثار اور پاکستانیوں پر ان کے احسان کے بدلے مالک یوم الدین سے اجر عظیم کی توقع رکھتے ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں حرف آخر یہ ہے کہ ہم کلمہ گو قائد اعظم کے نہیں' اللہ جل جلالہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ہیں۔ قائد اعظم کا احسان مانتے ہیں لیکن حکم اللہ اور رسول کا مانیں گے جن کی طرف سے ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو عبادت رب میں نہ ڈھالنے پر دنیا و عقبیٰ دونوں میں خسران عظیم کی وعید سنائی گئی ہے۔ بیگ حسن اختر مرزا صاحب (جو یہاں یقیناً مرزا حسن اختر بیگ رہے ہوں گے) کان کھول کر سن لیں کہ پاکستان میں رہنے والے (اور وطن چھوڑ کر دور دیس جا بسنے اور اغیار کی خدمت گزاری کا "شرف" حاصل نہ کرنے والے) مسلمان اس اتاترک کے نقش قدم پر نہیں چلیں گے جس نے مسلمانوں کی وحدت ملی کے علامتی ادارے' خلافت کی بقول اقبال' قبا چاک کر کے امت مسلمہ کے اعداء کا مشن پورا کیا بلکہ احیائے خلافت کے لئے کام کریں گے جو "یورپ کا مرد بیمار" نہیں ہو گی بلکہ منہاج نبوت پر ہو گی' اس دور خلافت راشدہ کی روایات کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کرے گی جو تاریخ انسانی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ اللہ کو منظور ہوا تو نظام خلافت کی شمع ہمارے اس خداداد ملک پاکستان میں ہی روشن ہو گی اور ان شاء اللہ پوری دنیا پر اللہ کے دین کے حتمی غلبے کی تمہید بنے گی جس کی بشارت اللہ کے سچے رسول ؐ نے دی ہے۔

پنجاب کے گورنر صاحب سے بھی ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ اپنے کام سے کام رکھیں اور اتاترک کو آواز نہ دیں وہ قائد اعظم کو بھی اتاترک ثانی سمجھنا چھوڑ دیں ورنہ اس ملک کا جواز ہی ختم ہو کر رہ جائے گا جس کے سب کے بڑے صوبے کے سب سے شاندار محل میں بیٹھ کر وہ دانشوری بھگارتے ہیں۔ خدارا قائد اعظم کی روح کو مزید ایذا نہ دیجئے' آپ لوگ انہیں کیا اس صدی کا سب سے جھوٹا (خاکم بدہن) سیاستدان قرار دلوانا چاہتے ہیں؟۔

ہمیں رسول اللہ ﷺ کی اس بشارت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ احیائے اسلام کے اس عمل کو اصل تقویت پہنچانے کی سعادت "خراسان" کا مقدر بنے گی جو ایران کے مشرقی حصے' افغانستان' پاکستان کے بڑے علاقے اور وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلمان ریاستوں پر مشتمل ہے۔ اس خطے کو اہل ایران آج بھی "خراسان بزرگ" کہتے ہیں۔ تحریک خلافت پاکستان نے اس آگہی کو عام کرنے کا کام شروع کیا ہے جس میں ہر مسلمان کا تعاون درکار ہے۔ پھر جن سعید روحوں میں خلافت کے اس ربانی نظام کی ضرورت کا احساس طلب سے بڑھ کر ایک تڑپ کا روپ دھار لے گا وہ ہماری اس انقلابی جدوجہد کا ساتھ دینے کے لئے بھی آگے بڑھیں گے جس کے لئے ایک قافلہ بنانے کے کام کا بیڑا بھی اٹھایا جا چکا ہے---○○

بقیہ : زندگانی کی گزرگاہوں میں

علیٰ عینی' علیٰ رأسی' آپ کے پرچے کے وہ صفحات کسی بہتر مصرف میں آئیں گے جو میں سیاہ کرتا ہوں۔ البتہ یہ صراحت ضروری محسوس ہوتی ہے کہ خاموشی کو میں نیم رضا نہیں' نکاسا جواب سمجھوں گا--- "ندائے خلافت" کی ادارت کی خدمت جیسی کچھ بن آ رہی ہے' ان شاء اللہ بدستور جاری رکھوں گا جس پر قارئین کرام سے کسی داد و دہش کی ضرورت نہیں' اللہ تعالیٰ شرف قبولیت بخشیں تو بہت ہے اور یہی ان کی شانِ کریمی کے شایاں بھی ہے۔○○

بقیہ : روداد سفر

کی جائے اللہ تعالیٰ پھل عطا فرماتے ہیں لیکن کوہستان کا ضلع خصوصی صفات کا حامل ہے۔ یہاں کے لوگ دین پر مرمٹنے والے ہیں بشرطیکہ وہاں مسلسل دورے کئے جائیں اور چپہ چپہ مقامی معاونین کی عملی تربیت کی جائے تاکہ وہ مستقل مزاجی سے کام کو پھیلاتے رہیں۔ اسی طرح ناران کا علاقہ ستائے ہوئے کاشتکاروں کے باعث Burning پوائنٹ ہے۔ اسے بھی محنت اور مناسب حکمت عملی سے تحریک کی وسعت کا باعث بنایا جا سکتا ہے۔

ان پندرہ دنوں میں الحمدللہ سبھی شرکاء قافلہ نے بھرپور محنت کی لیکن محترم شمس الحق صاحب کی انتھک شخصیت واقعتاً منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ تقریباً سولہ سو کلومیٹر کی ڈرائیونگ اور اس پر مستزاد ہر جگہ خطابت کی ذمہ داری' انفرادی رابطوں کا کام کرنا یہ انہیں کا حوصلہ ہے۔ حالانکہ وہ عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں تھکاوٹ لازم و ملزوم ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے جس والہانہ انداز میں تمام کام کئے وہ ان پر اللہ کے خصوصی فضل و کرم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے رفقاء کی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اللہ کریم ان کی مساعی جمیلہ کو شرف قبول عطا فرمائے۔ اسی طرح محترم محمد شمیم صاحب نے واقعتاً "سید القوم خادمھم" کا عملی ثبوت پیش کیا۔ انہوں نے امارت کی ذمہ داری جس محنت لگن اور شرکاء کے ساتھ شفقت و محبت سے ادا کی' وہ ایمان کی دولت کے بغیر ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سفر کو تحریک کے لئے قوت نو کا باعث اور شرکاء کے لئے توشہ آخرت بنائے۔ جو خیر ظہور پذیر ہوا اسی کا فضل تھا' جو شر سرزد ہوا وہ ہمارے نفوس کی شرارت تھی۔ اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے۔ آمین۔○○

بقیہ : واقعاتِ عالم

انسانی اور جمہوریت کا مستقبل تاریک دکھائی دیتا ہے۔ اسلام میں انتہا پسندی کو فروغ حاصل ہونے سے عالمی پیمانے پر دہشت گردی کو ہوا ملے گی جس سے ہر جگہ یہ اقدار مجروح ہوں گی۔ نسرین کا معاملہ صرف بنگلہ دیش تک محدود نہیں رہے گا۔ اس لئے اسے معمولی نہیں سمجھنا چاہئے۔

بقیہ کراچی

جس کے سامنے مغربی تہذیب کے یہ گماشتے اپنا بوریہ بستر سمیٹ کر اپنے آقاؤں کے دیس کا رخ کریں۔ جب تک ایسی کوئی تحریک نہیں اٹھتی ہمارے مصائب کم نہیں ہوں گے۔ اب اس ملک میں رہنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ غیر جانبدار رہ کر اپنی آئندہ نسلوں کو نہیں بچا سکتے۔ انہیں اپنی توانائیوں کو اس راہ میں لگانا ہو گا تاکہ ان کی آئندہ نسل کا مستقبل محفوظ ہو' ان کی اقدار بچ جائیں اور وہ خواب پورا ہو سکے جو قوم نے قیام پاکستان کی شکل میں دیکھا تھا۔ وہ خواب اس ملک میں اللہ کے دین کا نفاذ اور خلافت کا احیاء تھا۔○○

بقیہ فرمایا بھائی غفورے نے

ہیں اس کے باوجود وہ نہ مایوس ہیں نہ بد دل کیونکہ انہیں یقین ہے کہ مسلمان صرف "بشیر" ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ نذیر بھی ہوتا ہے اور جب تک یہ دونوں کردار ادا نہ کرے' وہ کامل مسلمان نہیں ہو سکتا!

قائمقام امیر تنظیم اسلامی چوہدری رحمت اللہ بٹر کی طرف سے

تذکیری مراسلہ

فرمان رب العالمین : انما المومنون اخوہ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون۔

آج میں بعض ایسے امور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جنہیں ہم میں سے ہر ایک کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک دفعہ نماز عصر کے بعد خطبہ دیا اور تمام واقعات کا ذکر کیا جو قیامت تک ہونے والے تھے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جس کسی نے ان کو یاد رکھا سو یاد رکھا جو بھول گیا سو بھول گیا۔ اس میں آنحضور ﷺ نے فرمایا بیشک دنیا بڑی سرسبز اور میٹھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی حکمرانی عطا کر دی ہے تاکہ وہ دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔ پس آؤ دنیا سے بچ جاؤ اور آؤ عورتوں (کے فتنوں) سے بچ جاؤ اور دیکھو قیامت کے دن ہر بد عہد کے لئے ایک جھنڈا اس کی پیٹھ کے پاس گاڑ دیا جائے گا اور دیکھو تم میں سے کوئی لوگوں کے خوف کی وجہ سے حق کہنے سے نہ رکے جب کہ وہ جانتا ہو کہ یہ حق ہے پھر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بنی آدم کے بہت سے طبقات ہیں ان میں سے وہ بھی ہیں جو مومن پیدا ہوتے ہیں اور زندگی بھی ایمان پر گزارتے ہیں اور ایمان ہی پر ان کی موت ہوتی ہے۔ ان میں سے وہ بھی ہیں جو کافر پیدا ہوتے کافر جیتے ہیں اور کافر ہی مرجاتے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو مومن پیدا ہوتے ہیں مومن زندگی گزارتے ہیں لیکن کافر مرتے ہیں اور وہ بھی جو کافر پیدا ہوئے کافر جیئے لیکن مومن مرے۔

اسی طرح آپ نے غصہ کے بارے میں فرمایا کہ بعض لوگ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں اور بہت جلد ان کا غصہ اتر جاتا ہے۔ یہ تو ایک کے بدلے دوسرا ہوا۔ اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو بہت دیر سے غصہ میں آتے ہیں لیکن بہت جلد ان کا غصہ ختم ہو جاتا ہے اور تم میں سے سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آئے اور دیر سے جائے۔ پھر آپ ؐ نے فرمایا غصہ سے بچو کیونکہ یہ ایک انگارہ ہے جو بنی آدم کے دل میں ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ان کے چہرے اور آنکھوں کو سرخ ہوتے ہوئے۔ پس جو کوئی غصہ کو محسوس کرے تو پہلو کے بل لیٹ جائے۔

پھر آپ نے قرض کے بارے میں فرمایا کہ تم میں سے وہ بھی ہیں جو ادائیگی میں برے ہیں لیکن خود وصول کرنے میں اچھا طریقہ استعمال کرتے ہیں تو یہ بھی ایک کا دوسرا بدلہ ہوا۔ تم میں سے بہترین وہ ہے کہ جب اس پر قرض ہو تو ادائیگی میں بہتر ہو اور جب اس نے لینا ہو تو لینے میں نرمی اختیار کرے اور بدترین وہ ہے جو قرض کی ادائیگی میں برا ہو اور لینے میں بدکلامی کرے۔ یہاں تک کہ جب سورج کھجور کے درختوں کے سروں پر پہنچ گیا تو آپ ؐ نے فرمایا آگاہ ہو جاؤ کہ اس دنیا کی زندگی اتنی ہی باقی ہے جتنا اس دن کا حصہ باقی اور اتنی گزر گئی ہے جتنا دن گزر گیا۔ (رواہ ترمذی)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے بیشک اچھائی اور برائی (معروف و منکر) دو تختیوں کی صورت میں قیامت کے دن نصب کر دی جائیں گی۔ پس معروف بشارت دے گی اپنے اختیار کرنے والوں کو اور برائی کہے گی ادھر آؤ ادھر آؤ اور انسان طاقت نہ رکھیں گے مگر اسے ساتھ چمٹائے بغیر۔ (رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان)

بیشک وہ شخص نجات پا جائے گا جو اسلام لایا اور رزق دیا گیا جو اسے کفایت کر گیا اور وہ قانع ہو گیا اللہ کی عطا پر۔ کیونکہ غنی تو نفس کا غنی ہوتا ہے نہ کہ مال و دولت دنیا کی کثرت رکھنے والا۔ (رواہ مسلم)

اللہ تعالیٰ ہمیں عہد کی پاسداری کرنے والے، غصہ سے بچنے والے، قرض کے بارے میں حسن ادائیگی اور نرمی طلب اختیار کرنے والے اور دنیا میں سے حلال اور کم پر قناعت کرنے والے بنائے رکھے۔ OO

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

علمائے دین کو 'ملّاں' کا نام دے کر حکومت دین بیزاری کو زبان دے رہی ہے

رجالِ دین نے بھی اپنا اصل کام کیا ہوتا تو پاکستان کو یہ دن دیکھنے نہ پڑتے

لاہور۔ ۲۸/ جولائی: ۔ تنظیم اسلامی کی مجلس عاملہ کے ترجمان نے کہا ہے کہ شدید خطرات میں گھرے ہوئے ہمارے وطن کو آج سب سے زیادہ ضرورت اپنے تشخص اور جواز کو محفوظ کرنے کی ہے جس سے اسے محروم کیا جا رہا ہے۔ لاہور میں قائم مقام امیر تنظیم جناب رحمت اللہ بٹر کی صدارت میں مرکزی مجلس عاملہ کے آخری اجلاس میں مجلس کے بزرگ رکن اور تحریک خلافت پاکستان کے ناظم اعلیٰ جنرل ریٹائرڈ ایم ایچ انصاری نے ملک کو درپیش حالات کا ایک جائزہ پیش کرتے ہوئے یاد دلایا کہ امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد نے آج سے نو ماہ پہلے ہی قوم کو خبردار کر دیا تھا کہ پاکستان اب تیزی سے سیکولرزم کی طرف جائے گا اور ظاہر ہے کہ ان کا اندیشہ درست ثابت ہو رہا ہے۔ مجلس ملک کی داخلی اور خارجی کیفیت پر تفصیلی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ صورت حال کی سنگینی میں حالیہ واقعات نے کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ حکومت اور حزب اقتدار دونوں کا صرف اسی ایک امر پر اتفاق نظر آتا ہے کہ ملکی سیاست کو دین و مذہب کی پابندیوں سے آزاد کرا لیا جائے اور ملک کو باقاعدہ سیکولرزم کی اسی راہ پر ڈال دیا جائے جو آج پوری دنیا کا چلن ہے۔ مجلس کی رائے میں پی ڈی ایف حکومت نے جس کی باگ ڈور پیپلز پارٹی کے ہاتھ میں ہے' علمائے دین کو "ملاں" کا نام دے کر دراصل اپنی دین بیزاری کو زبان دی ہے۔ جن لوگوں میں اب تک براہ راست اسلام کو گالی دینے کی ہمت نہیں تھی انہوں نے فرقہ واریت اور مسلکی اختلافات کو ہوا دینے والے دین کے نادان دوستوں کی مذموم حرکتوں کی آڑ میں لوگوں کو اصل دین سے بھی برگشتہ کرنے کی ایک مہم کا آغاز کیا ہے اور افسوس کہ اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ رکھنے والے بعض بزرگ اس مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو رہے ہیں۔

مجلس عاملہ نے وزیراعظم بے نظیر بھٹو سے کہا ہے کہ وہ معاشی معیشت جسے ترقی دینے کی وہ اٹھتے بیٹھتے بات کرتی ہیں' دنیا بھر کے ممالک کے بقا و استحکام کی ضمانت بن سکتی ہے لیکن پاکستان پر یہ نسخہ ہرگز کارگر نہ ہوگا جو ایک نظریاتی بنیاد رکھتا ہے۔ وطن عزیز کے استحکام کے لئے معیشت کی ترقی سے پہلے اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا واقعی اور عملی نفاذ ضروری ہے جسے اسلام کے راستے سے ہٹا کر فی الحقیقت اپنے اصل تشخص اور واحد جواز سے محروم کیا جا رہا ہے۔ تنظیم اسلامی کی مجلس عاملہ نے حکومت پر واضح کیا ہے کہ اس ملک میں ملائیت' پاپائیت یا تھیاکریسی کی عملداری دیکھنے کی مبینہ خواہش رکھنے والے حضرات اللہ کے دیئے ہوئے نظام حیات اجتماعی کی درست وکالت نہیں کرتے۔ یہاں ان لوگوں کی تعداد اب بھی اقلیت میں نہیں جو دین و سیاست کی دوئی سے پاک اسلام کے اسی آفاقی پیغام اور خدائی نظام حکومت کو انسانیت کا واحد ذریعہ نجات سمجھتے ہیں جس کی شرح گزشتہ چار صدیوں میں برصغیر پاک و ہند میں تجدیدی مساعی کے ذریعے ہوئی اور مصور پاکستان علامہ اقبال نے بھی اسی کا علم بلند کیا تھا۔ مجلس نے حکومت کو خبردار کیا ہے کہ دین اور رجال دین کے خلاف زبان درازی کی بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔

تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس عاملہ نے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اچانک اضافے پر بھی تشویش کا اظہار کیا اور سوال کیا ہے کہ شیعہ سنی منافرت نے آخر پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں ہی کیوں خانہ جنگی جیسے خطرے کے نشان کو چھو لیا ہے۔ مجلس کے بیان میں علمائے دین کی توجہ بھی اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ کم از کم اب تو انہیں بھی فروعی مسائل اور مسلکی مفادات کو نظرانداز کر کے اصل دین کی دعوت اور اس کے ذریعے دین کے غلبہ کی جدوجہد کا کوئی مسنون لائحہ عمل اختیار کر لینا چاہئے جو انہوں نے پہلے سے کیا ہوتا تو دین و مذہب کو اس ملک خداداد میں یہ دن نہ دیکھنے پڑتے جسے اسلام کے نام پر اور اسلام کا ماڈل بنانے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ وقت ان کے ہاتھ سے بھی نکلتا جا رہا ہے جس کے بعد ہاتھ ملنے کے سوا وہ آخر اور کیا کر سکیں گے؟۔۔○○

استعمال شدہ کمپیوٹر درکار ہیں!

قرآن کالج لاہور میں کمپیوٹر کلاس کا اجراء ان شاء اللہ نئے تعلیمی سال سے ہو جائے گا۔ اس ضمن میں کالج کو کچھ استعمال شدہ کمپیوٹروں کی بھی ضرورت ہوگی۔ جن افراد یا اداروں کے پاس ایسے کمپیوٹر برائے فروخت موجود ہوں وہ ازراہ کرم فوری رابطہ کریں:

حافظ عاطف وحید' وارڈن قرآن کالج ہاسٹل' ۱۹۱۔ اتاترک بلاک

نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور' فون 5833638۔5833637